ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

اکتوبر ۲۰۱۹ء | جلد ۱۱ | شمارہ ۴ | صفر ۱۴۴۱ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد ندوی 9045616218
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ: 25:00 روپے
سالانہ: 250:00 روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ: 500:00 روپے
بیرونی ممالک: 30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال): 4000:00 روپے

Bank Acount Detail: **Mr Saeed Ahmad Ansari**
Acount No: 6561000100039197
IFSC code: PUNB0656100
Punjab National Bank, Medical Road, Aligarh-202002
Mob. 9808850029

خط و کتابت کا پتہ:
مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر ڈی، کوارسی بائی پاس، علی گڑھ
e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

Designed and composed by Abdullah Maroofi, Mob. 8218439622; email-marufi.abdullah.alig@gmail.com

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundationaligarh.org

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	علماء کی ذمے داری	مولانا سید ابوالحسن علی حسن ندویؒ	
۲۔	اداریہ	محکوم قوم کا درماندہ دماغ	مدیر	۳
۳۔	پیامِ سیرت	محبت کی انوکھی مثال	محمد فرید حبیب ندوی	۱۴
۴۔	خاص تحریر	عالم عربی کی صورت حال-احادیث کی روشنی میں	مجیب الرحمٰن عتیق ندوی	۱۶
۵۔	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد- چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۲۴
۶۔	گوشۂ تاریخ	عہد اکبری مکتوبات امام ربانی کے آئینے میں	محمد خبیب	۳۰
۷۔	تاریخ کے جھروکوں سے	''اسلام میں مذہبی رواداری''	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۴۱
۸۔	نظریۂ جہاد	اسلام کا نظریۂ جہاد	ترجمہ: محمد سہیل ندوی	۴۸
۹۔	سفر نامہ	حیدرآباد کا ایک تعلیمی سفر	ڈاکٹر عبید اقبال عاصم	۵۴
۱۰۔	اسباب عروج و زوال	قوموں کی تعمیر و ترقی میں تعلیم کا کردار	محمد قمر الزماں ندوی	۶۰
۱۱۔	اصلاح حیات	بحث و تکرار	سر سید احمد خان	۶۳
۱۲۔	شعر و ادب	نعت پاک	ابوالمجاہد زاہد	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

محکوم قوم کا درماندہ دماغ

اس وقت ملک آزادی کے بعد سے اب تک کی تاریخ میں سب سے زیادہ پُر خطر اور نازک ترین صورت حال سے گذر رہا ہے، یہ حالات یوں ہی نہیں آئے ہیں بلکہ غیروں کی شبانہ روز محنتوں اور منظّم کوششوں اور ہماری غفلت اور غلط پالیسیوں کے نتیجہ میں ہم پر مسلط ہوئے ہیں، یہ موقع اپنے احتساب کے ساتھ مستقبل کے تحفظ کا خاکہ تیار کرنے کا ہے، صرف اگر ان حالات کے اسباب و احتساب کی بحث چھڑی تو ہماری رگِ اختلاف پھڑ کے گی، ہم وقت و حالات کی نزاکت سے قطعِ نظر مخاصمت ومخالفت سے باز نہ رہ سکیں گے۔

پارلیمنٹ کے گذشتہ سیشن میں تین قانون پاس ہوئے ہیں، UAPA قانون محض مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے اور انھیں بلا دلیل دہشت گرد بنا کر جیلوں میں ٹھونسنے کا ایک ذریعہ ہے، RTI قانون میں ترمیم کے ذریعہ حکومت نے اپنے آپ کو بالکل ہی محفوظ (Secure) کرلیا ہے، طلاقِ ثلاثہ قانون نے مسلمانوں کی زندگی اجیرن بنا دینے کا الارم بجا دیا ہے، یہ اب تک کا سب سے لولا لنگڑا، گنجلک اور غیر واضح قانون ہے، طلاق واقع نہیں ہوگی مگر مرد کو سزا ملے گی، نفقہ دینا پڑے گا، پھر سزا کاٹنے کے بعد اسی خاتون کے ساتھ رہنا ہوگا، اس درمیان متاثرہ خاتون اور بچوں کا ہر ممکن استحصال ہوگا، اس کی ذیلی شقوں کی رُو سے قانون حضانت، قانون نفقہ اور خلع کے ساتھ طلاق بائن کی ہر شکل کو کالعدم قرار دے دیا گیا، صرف طلاق رجعی کی اجازت دی گئی ہے جس کا اختیار بہر حال مرد کو ہے، مگر اس صورت میں عورت کیا کرے گی جب وہ صرف طلاق بائن اور خلع کا مطالبہ کرتی ہے، بہر حال اس موضوع پر مجھے یہاں کچھ نہیں عرض کرنا ہے، جو کچھ لکھنا تھا وہ ہم ۲۰۱۶ء میں لکھ چکے، بحمد للہ اہل علم نے اس کی پذیرائی کی تھی مگر افسوس کہ ارباب اختیار نے طالب علمانہ معروضات کو کوئی اہمیت نہ دی، اب بھی اگر طلاق ثلاثہ کے عنوان سے کوئی مہم چلائی گئی تو صرف قومی سرمایہ برباد ہوگا نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا، طلاقِ ثلاثہ سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اگر اس قانون کی ذیلی شقوں کو خواتین کی تنظیموں کے ذریعہ چیلنج کیا جائے تو کچھ بات بن سکتی ہے، کیونکہ اس صورت میں بات وزن دار ہوگی جبکہ طلاق ثلاثہ کا عنوان ہی اغیار بلکہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں ہمارے موقف کو بے وزن کر دیتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بی جے پی یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کا ایجنڈا رکھتی ہے، طلاق ثلاثہ کا قانون لوگوں کے بقول اس کی طرف ایک قدم ہے، لیکن مجھے اس سے اختلاف ہے، بی جے پی کا مقصد صرف مسلمانوں کو پریشان کرنا اور ان کی توانائی کو مفلوج کرنا ہے، یونیفارم سول کوڈ کا نفاذ دیگر وجوہات اور بالخصوص ہندوؤں کے مختلف طبقات کے پیش نظر بہت مشکل ہے اگرچہ

ناممکن نہیں، طلاق ثلاثہ قانون کے لیے بی جے پی آخر اس قدر بے تاب کیوں ہوئی؟ اس کے جواب میں بہت سے تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ یہ مسلمانوں کے دراصل اس چیلنج کا بی جے پی نے جواب دیا جو اس کو بار بار چیلنج کیا گیا کہ ''شریعت میں مداخلت برداشت نہیں کی جائے گی''، اس میں شدت اس لیے آئی کہ ایک مؤقر اسٹیج سے وامن میشرم کو بار بار خطاب کا موقع دیا گیا اور انھوں نے کھل کر برہمنزم کے خلاف بات کی، یونیفارم سول کوڈ پر واویلا کیا، بی جے پی کو لعن طعن کیا، **یاد رکھنا چاہیے کہ اقلیت میں رہنے والی قومیں چیخ پکار اور زبانی چیلنج سے نہیں مضبوط حکمتِ عملی اور خاموش منصوبہ بندی سے مورچے فتح کیا کرتی ہیں**، یہاں تو پشت پر کوئی سہارا بھی نہ تھا، گرتی ہوئی دیوار کا سہارا لینا اور اس کو سہارا دینا دونوں ہی حکمتِ عملی کے خلاف ہے اور پھر اس کے علاوہ ہم نے کوئی آپشن تیار بھی نہیں کیا، سوچیے ذرا طلاق بل پر راجیہ سبھا سے تمام سیکولر پارٹیوں نے واک آؤٹ کیا، آخر کیوں؟ UAPA بل کی لوک سبھا میں کانگریس نے مخالفت کی مگر راجیہ سبھا میں سپورٹ کیا، آخر کیوں؟ غور کیجئے تو بہت سے عُقدے کھلتے چلے جائیں گے۔

یہ کون نہیں جانتا کہ بی جے پی آر ایس ایس کا سیاسی چہرہ (Political Wing) ہے، اور اس سے کون واقف نہیں کہ آر ایس ایس کی بنیاد ہی عنصریت، نسل پرستی اور بالخصوص مسلم دشمنی پر ہے، اگر آر ایس ایس اپنے ایجنڈے سے مسلم دشمنی اور فرقہ پرستی نکال دے تو پھر اس کی شناخت ختم ہو جاتی ہے، اس نے اپنے قیام کے وقت اپنا یہ ایجنڈا منتخب کیا تھا اور آج بھی وہ اس پر قائم ہے، ابھی دو دن قبل بھاگوت جی کا یہ بیان آیا ہے کہ بھارت میں بسنے والا ہر فرد ''ہندو'' ہے اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے، ''ہندتوا'' آر ایس ایس کا خواب اور اس کا عقیدہ ہے، آر ایس ایس کی تعریف کے مطابق اپنی اسلامی شناخت کے ساتھ رہنے والے اس وقت تک ہندستانی نہیں ہو سکتے جب تک وہ ہندوستانی کلچر میں پوری طرح نہ رنگ جائیں، بھاگوت کے یہ کہنے کا کہ ''ہندتوا مسلمانوں کے بغیر مکمل نہیں'' یہی مطلب ہے، آر ایس ایس کی سخت گیری اور موجودہ حالات کا جبر وقہر دیکھتے ہوئے بھی اگر کوئی یہ کہے کہ آج کل آر ایس ایس مسلمانوں کے تئیں نرم رویہ اپنا رہی ہے، وہ فرقہ پرستی کا عنصر اپنے ایجنڈے سے نکال کر قومی یکجہتی کے بارے میں سوچ رہی ہے تو یہ بات بڑی عجیب اور سادہ لوحی سے عبارت معلوم ہوتی ہے، آر ایس ایس نے اس ملک کے لوگوں کو بالخصوص منصف مزاج اور اس کے نظریہ سے اتفاق نہ رکھنے والے لوگوں کو اپنی سازشی اور حکومتی طاقت کے بل پر مجبور کر دیا ہے، اب یا اس کی زبان بولنا ہے یا جیل کی سلاخیں تیار ہیں، آج تک جس آر ایس ایس کے لیے چیخ چیخ کر یہ بات کہی گئی کہ فرقہ پرست طاقتیں برسر اقتدار آئیں تو یہ ملک ٹوٹ جائے گا، بکھر جائے گا آج اچانک اسی تنظیم کے تئیں رویّہ میں اچانک نرمی؟ دراصل یورپ اور مغربی ممالک نیز اقوام متحدہ میں بی جے پی اور آر ایس ایس کی شبیہ پر سوالیہ نشان لگ رہے تھے، بھارت سے زیادہ یورپ میں مظاہرے ہو رہے تھے، عالمی منظر نامہ پر آر ایس ایس کی شبیہ کو صاف کرنا تھا سو وہ یہ پیغام دینے میں آر ایس ایس کامیاب رہی کہ ملک کے مسلمان اور ان کی اعلیٰ قیادتیں ہمارے ساتھ ہیں، ہم تو بار بار لکھتے رہے ہیں کہ ''سمندر میں رہ کر مگرمچھ سے بیر درست نہیں'' ۲۰۱۴ء میں بی جے پی کے برسرِ اقتدار آنے پر ہم نے بہت واضح طور پر لکھا تھا، ملاقاتیں ہونی چاہئیں اور بار بار ہونی چاہئیں، اپنے پاس پیام دعوت اور آفاقی پیغام رکھنے والوں کی اولین ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں سے ملتے رہیں، سیکولر ملک میں بسنے والی اقلیتوں کے لیے کسی ایک پارٹی کے پاس اپنا ووٹ بلکہ اپنا وجود گروی رکھنے کا رویہ بھی درست نہیں، کسی کو دوست اور کسی کو اعلانیہ دشمن قرار دینا درست نہیں، ایسی صورت میں اگر اچانک بغیر کسی ایجنڈے کے ذریعہ ملاقات ہوگی تو وہ محض شخصی ملاقات قرار

دی جائے گی، ایسی ملاقاتوں کا سلسلہ ہونا چاہیے، واضح ایجنڈے کے ذریعہ اپنی قوم کو اعتماد میں لینا چاہیے، ہمیشہ وقت کی نزاکتیں اس لحاظ سے پیش نظر رہیں کہ ہماری ذات سے کہیں دوسرے غلط فائدہ نہ اٹھالیں۔

صفت کی بات یہ ہے کہ NRC کا بل بھی پاس ہونے کی تیاری ہے، اس قانون کے تحت آئندہ سیٹزن شپ کا رجسٹریشن شروع ہوگا اور اس میں ایسی پیچیدگیاں پیدا کی جائیں گی کہ کروڑ دو کروڑ مسلمانوں کی نیشنلٹی پر سوالیہ نشان لگا کر انھیں بے گھر کر دیا جائے گا، بلکہ بہت ممکن ہے کہ ایسی فہرست تیار کر لی گئی ہو کہ کس کس کو اس کی زد میں لینا ہے، یاد رکھا جائے کہ اس عمل میں کسی بھی علاقہ کے ''اشرافیہ'' زد میں نہیں آئیں گے، ظاہر ہے کہ اس عمل میں ملک کے خزانے کا بڑا حصہ صرف ہوگا، عوام ذہنی اور جسمانی طور پر بے پناہ الجھنوں اور پریشانیوں کا شکار ہوں گے، نان شبینہ کے محتاج مارے مارے پھریں گے، ایسے میں جو لوگ اس قانون کے بائیکاٹ کی تحریک چلانے کے بجائے اس کا استقبال کر رہے ہیں معلوم نہیں وہ کس زبان سے کر رہے ہیں، اگر الیکشن کمپین کے دوران دیے گئے اَمِت شاہ کے بیان کو ملحوظ رکھیں تو اس عمل سے ہندو، عیسائی اور بودھ باہر ہوں گے، پھر بچا کون؟ کس کو پریشان کرنا ہے، خدارا اس وقت یا تو نہ بولیے اور بولیے تو پہلے تولیے۔ بلاشبہ عام حالات میں بھی اپنے کاغذات تیار رکھنا چاہیے، اس میں غفلت درست نہیں، مگر اس طرح اگر ہر قانون کی تائید کی گئی اور ہر مصیبت کا استقبال کیا گیا تو خطرہ ہے کہ اس ملک کی جمہوریت ہی ختم کر دی جائے، نوٹ بندی سے لے کر اب تک کئی ایسے فیصلے آئے جن پر جمہوری احتجاج ہونا چاہیے، جو نہیں ہوا، اس سے لگتا ہے کہ ملک میں جمہوریت کمزور ہو رہی ہے اور وہ ڈکٹیٹر شپ کی طرف بڑھ رہا ہے۔

ہم بار بار چیختے رہے، ہمارے طالب علمانہ اداریے اس کے گواہ ہیں، مگر ارباب اختیار نے کبھی گفتگو کے لائق بھی نہ سمجھا، اب ہم طلاق کے عنوان سے آگے نہیں بڑھ پا رہے ہیں، ابھی تک اسی کے پیچ وخم میں الجھے ہوئے ہیں جبکہ حکومت نے ہمارے تشخصات کو ختم کرنے، بڑے پیمانے پر بے گھر کرنے، قتل عام کرنے کے بڑے بڑے منصوبے تیار کر لیے ہیں، سب کچھ بہت منظم انداز میں ہوگا، آپ کی شہنائیاں بھی بجتی رہیں گی، پیٹ پوجا بھی چلتی رہے گی، جلسے بھی ہوتے رہیں گے، جشن کی تیاریاں بھی جاری رہیں گی اور آزادانہ زندگی کا دائرہ بھی تنگ ہوتا رہے گا، دیکھا نہیں آپ نے کہ آپ تین طلاق پر ماتم کرتے رہے، جوہر یونیورسٹی اور دیوبند کے وقار پر بٹہ لگنے کا سوگ مناتے رہے اور ادھر کشمیر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ ہوگئی، انٹرنیٹ سروسز بند ہوگئیں، اور پھر صبح کو راجیہ سبھا میں صدارتی حکم کے ذریعہ دفعہ 370 اور 35A کو کالعدم دے دیا گیا، آئندہ مزید کیا ہوگا کچھ نہیں کہا جاسکتا، آج ۳۸ رواں دن ہے کہ وہاں کی عام زندگی مفلوج ہے، مظالم اپنی انتہا پر ہیں، کیا کسی گھر میں کوئی مریض نہ ہوگا، کیا ڈاکٹروں کی ضرورت نہ ہوگی، کتنے لوگ ہوں گے جن کے یہاں مہینوں کی خوراک، دودھ، دوا اور غذا موجود ہوگی؟ دنیا بھر سے عوام کے رابطے کاٹ دیے گئے، آخر کیوں؟ کیا دہلی پریس کلب میں صحافیوں کی پریس کانفرنس میں جن حالات پر تشویش کا اظہار کیا گیا وہ سب جھوٹ ہیں، کیا کشمیر میں کوئی داخل نہیں ہوسکتا، کسی کو جانے کی اجازت نہیں یہ بھی غلط ہے، کیا بی بی سی کی آزادانہ رپورٹنگ بھی غلط ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ اب تک تیس سے چالیس ہزار کشمیریوں کو گرفتار کر لیا گیا؟ کون سا بھارتی اور بھارتی مسلمان ہے جو کشمیر کو اپنے وطن عزیز کا حصہ نہیں مانتا؟ یہ کون سی نئی بات بتائی گئی اور اعلان کیا گیا کہ ''کشمیر ہمارا تھا، ہے اور رہے گا''، یہ تو ہر ہندستانی کا بے لاگ موقف ہے، اس وقت بات اس پر ہونی چاہیے تھی کہ کشمیر ہمارا ہے اور ہمارا رہے گا، کشمیر کی طرف

آنکھ اٹھا کر دیکھنے والوں کی آنکھیں نکال لی جائیں گی، مگر یاد رکھیں کہ ہمیں کشمیر کی زمین سے زیادہ کشمیری عزیز ہیں، ان پر پابندی کیوں؟ ان کا محاصرہ کیوں؟ ان پر ظلم کے پہاڑ کیوں توڑے جارہے ہیں؟ کشمیر کو اپنانے کے لیے ظلم ڈھانے کی کیا ضرورت؟ کیا پارلیمنٹ میں منصف مزاج غیر مسلموں نے آواز نہیں اٹھائی، کیا انصاف پسند غیر مسلم 370 کے غیر آئینی طریقہ سے ہٹانے کا مقدمہ لے کر سپریم کورٹ نہیں پہنچے، پھر ایسے میں بی جے پی کے ''جھوٹے اور مصنوعی نیشنلزم'' کی اپنے بیانات سے تائید چہ معنی دارد؟ عالمی ذرائع ابلاغ کا جائزہ لیجئے تو اندازہ ہوگا صرف چند تبصروں اور اردو کے بے جان اور بچکانہ بیانات پر مشتمل اخبارات سے کام نہیں چلے گا، ہمارے بیان سے بی جے پی عالمی منظر نامہ پر اپنا چہرہ صاف کررہی ہے کہ کشمیر کے حالات نارمل ہیں، مسلمانوں کی قیادت اس معاملہ پر ہمارے ساتھ ہے، انصاف پسند سیکولر ہندوؤں، صحافیوں، سوشل ورکر اور وکلاء نے اپنا سر پیٹ لیا، ابھی کل ہی ملک کی ایک بڑی تنظیم کی وزیر داخلہ سے ملاقات کی رپورٹ پڑھنے کو ملی، پڑھ کر ایسا لگا کہ جیسے وفا شعار شاگردوں نے محبوب استاد کو کوئی سبق روانی سے سنا دیا ہو یا یوں کہیے کہ یہ رپورٹ ایسے ہی تھی جیسے ایک فلمی ایکٹر نے انتخابات سے قبل مودی جی کا انٹرویو لیا تھا، اور تو اور صورت حال یہاں تک آ پہنچی کہ تاریخ کو مسخ کرنے کا جو کام انگریز حکومت کی سرپرستی میں فرقہ واریت کا بیج بونے کے لیے شروع ہوا تھا جس کے سبب آر ایس ایس نفرت کی کھیتی کرنے، اور دماغوں میں نفرت کے بیج بونے میں کامیاب ہوئی، آج اس کے موقف کی ترجمانی ہم بھی کرنے لگے، تاریخ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ظلم و جبر کے جتنے الزامات شواجی پر لگائے گئے، تاریخ کو مسخ کرنے کی مہم میں ان سارے الزامات کو اورنگ زیب عالمگیر کے سر منڈھ دیا گیا، یہ کام خاص طور پر جدوناتھ سرکار اور اس جیسے دوسرے مؤرخین نے انجام دیا، مگر کعبہ کو صنم خانے سے پاسباں ملنے کی روایت پرانی ہے، اوم پرکاش پرساد اور بی این پانڈے اور دوسرے انصاف پسند مورخین نے سارے اعتراضات کا جواب دیا، انھوں نے شواجی جن کو ہندوؤں نے ہیرو بنا کر پیش کیا، اس کی کہانی بھی بیان کی اور اورنگ زیب کو ہندستان کی تاریخ کا سب سے عادل اور کامیاب حکمراں بھی ثابت کیا، افسوس کہ ہم ان منصف مزاجوں کو چھوڑ کر ان فرقہ پرستوں کی زد میں آ کر اپنی تاریخ کو خود ہی جھٹلانے لگے اور اپنے ہیرو پر بھی شک کرنے لگے۔

ہماری محکومی کی داستان پرانی ہے اور طویل ہے، ماقبل ۴۷ اور خاص طور پر مابعد ۴۷ کی سیاست سے اس کا رشتہ گہرا ہے، محکوم دماغ پسماندہ ہوتا ہے، اس کی درماندگی اس کو صحیح فیصلے نہیں لینے دیتی، وہ صحیح رخ نہیں متعین کرپاتا، وہ اپنی صحیح ترجیحات نہیں طے کرپاتا، آپ ذرا بے لاگ جائزہ لیجئے تو اندازہ ہوگا کہ ہم اس وقت کہاں کھڑے ہیں اور کس طرح کی بحثوں میں الجھے ہوئے ہیں، ستر سال کے سفر میں ہم نے کیا کھویا، کیا پایا، ستر سال میں ہم یہ نہ طے کرسکے کہ ہم کو کیا کرنا ہے، کیسی تیاری کرنی ہے، نصاب تعلیم کیا ہونا ہے، ادارے کیسے ہونے ہیں، کس طرح کے لوگوں کو تیار کرنا ہے، ملت کی کشتی کا سہارا کیسے لوگ بن سکتے ہیں، سیاست کرنا ہے یا نیم سیاسی رہنا ہے یا سیاسی غلامی کا طوق گلے میں ڈالے رکھنا ہے، ستر سال ہم نے کانگریس کی غلامی کی، وہ ہمارے ہر سیاہ سفید کی مالک رہی، حتی کہ ہم سیاسی ہی نہیں بلکہ سیاست کے لیے ضروری ستونوں مثلاً ایمانی، جسمانی، تعلیمی اور اقتصادی طور پر بھی پسماندگی و درماندگی کا شکار ہوگئے، اچانک بت ٹوٹا تو اب کدھر جائیں یہ بھی نہیں طے ہو پارہا ہے، علامہ سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۰ء میں مولانا دریابادیؒ کے نام اپنے ایک خط میں یہ عُقدہ حل کردیا تھا، ان کی بات اس لیے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ وہ تاریخ کے رازداں تھے، تاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے، جہاں دیدہ تھے، کانگریس، تحریک خلافت اور جمعیۃ العلماء سے وابستہ رہے تھے، ان سب کو اس وقتِ فکری غذا فراہم کی

تھی، ان کے ایک جملہ نے دماغ کو جکڑ لیا اور صدی بھر کی تاریخ بالخصوص ۱۹۴۷ کے بعد سے اب تک کی کارکردگی نظروں میں گھومنے لگی، اصل خطا کا ادراک ہونے لگا، سید صاحب کا یہ جملہ آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے ''محکوم قوم کا درماندہ دماغ فلسفۂ عمل کے نکتہ کو بھی نہیں سمجھ سکتا''، یہ پورا اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''فروری کا معارف پہنچا۔ میں قطعاً آپ کی اس رائے کا مؤید نہیں کہ خسرو کی تلاش کرو، تغلق کی نہیں، سعدی چاہیے، سعد زنگی کی حاجت نہیں، حافظ مطلوب ہے۔ شاہ شجاع نہیں، ابن رشد کو ڈھونڈو، حکم کو نہیں، شیخ الاشراق بس ہیں، سلطان ایوبی درکار نہیں، ابن سینا سے مطلب ہے، خوارزم شاہ اور ابوالمعانی قابوس نہیں، میرے امن طلب دوست اور سکون پسند فلسفی ''تخیل'' اور ''عمل'' دو مختلف عالَم ہیں، تغلق نے خسرو کو پیدا کیا، اکبر نے عرفی کو نشو ونما بخشا، قابوس وخوارزم شاہ نے ابن سینا کو ابن سینا بنایا، دولت سامانی نہ ہوتی تو ابن سینا کو گنجینۂ علوم کتب خانہ میسر نہ آسکتا تھا، سلجوق وترک نہ ہوتے تو جلال الدین رومی ایشیائے کوچک کی سرزمین میں نہ پیدا ہوتے، محکوم قوم کا درماندہ دماغ فلسفۂ عمل کے نکتہ کو بھی نہیں سمجھ سکتا، بوس اگر حاکم قوم میں پیدا ہوتا تو اس کو اپنے تجربہ خانے کے لیے در بدر بھیک نہ مانگنی پڑتی۔ ٹیگور کا عالم تخیل اگر اس کی دنیائے عمل کے مطابق ہوتا تو خطاب اعزاز سے محرومی پسند نہ کرتا۔ انسان کے تمام دماغی وجسمانی قویٰ اس کے قوائے مہیجہ کے ماتحت ہیں۔ دل افسردہ قوم کے لیے نہ فلسفہ کا امن اور نہ شاعری کا ہنگامہ، کوئی چیز مطلوب نہیں۔ خیام کا پرسکون دماغ ملک شاہ سلجوقی کی تلوار کے سایہ میں آرام پا رہا تھا''۔

اس کے بعد ذرا اپنی حالت، کارکردگی، وقتی ردعمل اور جلسوں ومظاہروں عمل میں بے ضابطگی، عدم تسلسل اور طویل المیعاد منصوبہ بندی پر نظر ڈالیے اور سید صاحبؒ کی یہ تشخیص ملاحظہ لیجئے:

''ہماری حالت اس دائم المریض بیمار کی ہے جس کو دورہ کی بیماری ہو کہ جب دورہ پڑتا ہے تو ہائے وہو سب کچھ ہے اور جب اس میں تخفیف ہوگئی تو پھر اپنی صحت سے تغافل ہے، ایسا بیمار کیا اچھا ہوسکتا ہے''۔

اور مزید ہماری موجودہ تصویر، ہمارا انتشار، اور ہماری واقعی صورت حال ان ہی کے الفاظ میں دیکھیے، ایسا لگتا ہے سو سال پہلے کے لئے نہیں بلکہ آج کی صورت حال کی عکاسی کے لیے لکھا ہے:

''مسلمانوں کا موجودہ دور مسلمانوں کے لیے سخت قلق افزا ہے، رہنما مختلف الرائے اور عوام غافل وبے پروا ہیں، جب ان کو صحیح یا غلط نام سے جوش میں لایا جاتا ہے تو کچھ دور دوڑتے ہیں اور پھر تھک کر بیٹھ جاتے ہیں، پھر ان کے جوش وغیرت کے لیے رہنما کوئی نیا تماشا کھڑا کرتے ہیں اور پھر ہاتھ پاؤں جھاڑ کر کھڑے ہوتے ہیں، ۱۰ء سے لے کر آج تک یہی سلسلہ قائم ہے، کیا یہ زندگی کی علامت ہے''۔

ہماری تصویر مزید صاف ہوجائے، فکر وعمل کی غلطی مزید واضح ہوجائے، ہماری منصوبہ بندی کی کمی اور عمل میں تساہلی یا عدم تسلسل مزید واضح ہوجائے اس کے لئے ہم یہاں دور آخر کے مفکر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے دو اقتباس نقل کرتے ہیں، مولانا شاہ بانو کیس میں مسلمانوں کی کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے مستقبل کے خطرات اور ان سے نمٹنے کی تیاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''لیکن یہ جزوی ومحدود کامیابی تھی، مسلمانوں کے سروں پر یونیفارم سول کوڈ کی تلوار اب بھی لٹک رہی ہے، اور اس کے نفاذ کے بعد یہ بل بھی غیر مفید وغیر مؤثر ہوجائے گا، اور مسلم پرسنل لا میں مداخلت کے بیسیوں دروازے کھل جائیں گے''

مولانا مزید وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں:

''حقیقت میں ایک جمہوری ملک میں جو اکثریت کے ذریعہ (جس کے جذبات خواہشات ومقاصد بدلتے رہتے ہیں) آئین سازی کا دائمی وکلی حق رکھتا ہے، کسی فرقہ واقلیت کو (جو اپنا مستقل دین، عائلی قانون اور ملی تشخص رکھتی ہے، اور وہ اس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے) کسی وقت بھی مطمئن ہوکر بیٹھنے اور حالات وحقائق سے آنکھیں بند کرلینے کی گنجائش نہیں، اس کے متعلق فاتح مصر عمرو بن العاص کی وہ آگاہی اور انتباہ بالکل حسب حال ہے، جو انھوں نے مصر کے فاتح ونئے حاکم عرب مسلمانوں کو دیا تھا، انتم فی رباط دائم (تم مستقل محاذ جنگ پر ہو) تمہیں ہر وقت چوکنا اور خبردار رہنے کی ضرورت ہے''۔

ان اقتباسات کی روشنی میں جائزہ لیجئے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں، غلطی کہاں ہوئی اور ہورہی ہے، مگر افسوس کہ منصفانہ جائزے کی بھی اجازت نہیں، عجیب مزاج بنایا گیا ہے، ملت ہی اپنے خون پسینہ کی کمائی سے آگے بڑھاتی ہے مگر ملت کو ہی احتساب کا حق نہیں، اگر مؤدبانہ ومخلصانہ انداز میں بھی سوال پوچھ لیے گئے تو راندۂ درگاہ، بے توفیق اور ذہنی مریض قرار دیے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں، زبانوں پر تالے ڈالنے کی کوششیں ہوتی ہیں، انگلیاں تراش دی جاتی ہیں، قلم خرید لیے جاتے ہیں، کوئی مفادات کے دام میں بکتا ہے، کوئی عقیدت میں بک جاتا ہے، کوئی نسبتوں کے احترام میں قلم کا سودا کرلیتا ہے، بکنے کے بھی طریقے مختلف ہوتے ہیں، جو نہ بکے اسے خود سپردگی کے لیے مجبور کرنے کے سارے طریقے اپنائے جاتے ہیں، صورت حال کچھ یوں ہے:

وہ جو خواب تھے میرے ذہن میں نہ میں کہہ سکا نہ لکھ سکا
کہ زباں ملی تو کٹی ہوئی کہ قلم ملا تو بکا ہوا

حالانکہ مخلصانہ احتساب اور مثبت تنقید زندہ قوموں کی علامت ہے، اسے حسد، ذات کی تنقید، شخصیت سے بُعد اور گروہ بندی کا ذریعہ سمجھنا ذہنی بیماری ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ نے قیادتوں کی خطاؤں پر گرفت ونصیحت وتنقید کو قوم کے زندہ رہنے کی ضمانت قرار دیا ہے:

''جب ایک بڑھیا خلیفۂ ثانی کو ٹوک سکتی ہے تو ایک مسلمان یا مؤرخ کو یہ حق کیوں

حاصل نہ ہو کہ وہ اپنے قائدین کا محاسبہ کرے.....عمر ابن الخطابؓ کے زمانہ میں ہر مسلمان کو یہ حق حاصل تھا کہ ان سے جواب طلب کرے، ایک دفعہ وہ مسجد نبویؐ میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور کہا کہ سنو لوگوں! اور اطاعت کرو، ایک صحابیؓ کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہم نہیں سنتے، خلیفہ نے کہا کیوں؟ لوگوں نے کہا آپ کے جسم پر مال غنیمت کی دو چادریں نظر آرہی ہیں، جبکہ ہم لوگوں کے حصہ میں ایک ہی ایک آئی ہے، حضرت عمرؓ نے کہا کیا یہاں عبداللہ بن عمر موجود ہیں؟ وہ کھڑے ہوئے اور کہا کہ ایک چادر میرے حصہ کی ہے، جو میں نے انھیں دے دی ہے، صحابی نے کہا ٹھیک ہے، اب ہم ہر حکم کی اطاعت کے لیے تیار ہیں''۔

اسی ضمیر اور اسی جرأت وہمت کے ساتھ یہ امت زندہ رہی اور حادثات ومصائب کا سامنا کرتی رہی اور اپنی طویل تاریخ میں ترقی یافتہ اور بیدار شعور کا ثبوت دیتی رہی ہے اس نے ہمیشہ حق وانصاف کا ساتھ دیا ہے، غلطیوں اور کوتاہیوں کے ارتکاب پر گرفت کی ہے، اور انہی اوصاف کے ساتھ مستقبل میں بھی زندہ رہ سکتی ہے''۔(عالم عربی کا المیہ ص ۱۲۸)

ہم نے بار بار لکھا کہ بدلتے ہوئے ہندوستان میں مدارس کے تحفظ کے تئیں ہم کو سنجیدہ اقدامات کرنے چاہئیں، اس سلسلہ میں سب سے اہم تجویز ہم نے یہ پیش کی تھی اور کئی سال پہلے پیش کی تھی کہ ایک متحدہ بورڈ بنایا جائے جسے حکومت سے منظوری حاصل ہو، مدارس کے ثانویہ کا اس سے الحاق ہو، اس بورڈ سے ہائی اسکول کی سند ملے اور اس طرح نصاب میں خود ہی مفید ترمیم کر لی جائے جس سے اپنی ضرورت بھی پوری ہو اور مدارس کو تحفظ بھی حاصل ہو، مگر نصاب کی ترمیم کی بات ہمیشہ دیوانے کی تیر بھی قرار دی گئی اور اب جب پورے ملک کی صورت حال دگرگوں ہوئی تو وہی لوگ یہ تجویز بھی پیش کرنے لگے جو اب تک مخالفت کرتے تھے، سال دو سال قبل ہم نے لکھا تھا، اور مجلسوں میں تو بار بار کہا تھا کہ بی جے پی اگر دوبارہ اقتدار میں آئی تو کھل کر مدارس پر ہاتھ ڈالے گی، جس کی ابتدا وہ پہلے ہی کر چکی تھی، مگر کسی نے نہ سنا، اب صورت حال یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند جیسے ادارہ کی لائبریری کی عمارت کو انکوائری کا موضوع بنایا گیا، انکوائری کے لیے پوری طرح فورسز بھیجی گئیں، یہ ایک پیغام تھا کہ ''جس کو تم سب سے زیادہ محفوظ ومحترم سمجھتے ہو، جس پر تمہیں سب سے زیادہ ناز ہے دیکھو وہ بھی ہماری دسترس سے باہر نہیں''، ورنہ ایک تعمیراتی کام کی انکوائری کے لیے ایسے فورس نہیں بھیجی جاتی، پھر ملک بھر میں کتنے مٹھوں، مندروں، گردواروں اور نجی عمارتوں اور گھروں کے نقشے پاس کرائے جاتے ہیں، حقیقت میں ایک فیصد لوگ بھی نقشہ پاس نہیں کراتے، پاس کرانے میں اتنی شقیں ہوتی ہیں اور قانونی پیچیدگیاں اور مطالبات ہوتے ہیں کہ جو لوگ پاس بھی کراتے ہیں وہ رشوتیں دے کر کراتے ہیں، آفیسر بدلتے ہیں تو کبھی بھی پھر رشوت کا بھوت منہ پھاڑ دیتا ہے، اس جنگل راج میں صرف دارالعلوم کی لائبریری کیوں نظر آئی؟ سوال ہے غور وفکر کے لیے۔

اس کے علاوہ بھی متعدد مدارس کے متعلق رپورٹ ملی ہیں جہاں پولیس پہنچ چکی ہے، اول تو ملک میں رہ کر ملک کے قانون کی خلاف ورزی خود ایک جرم ہے، دوسرا جرم وقت رہتے تحفظ کی فکر نہ کرنا ہے۔

رامپور کی عظیم الشان محمد علی جوہر یونیورسٹی پر بلڈوزر چلانے کے لیے دشمن بے تاب ہے، اعظم خاں یا ان کی پارٹی سے

مجھے کوئی سروکار نہیں بلکہ میں تو ہمیشہ ان کی پارٹی اور ان کا ناقد رہا، مگر اس یونیورسٹی کی تعمیر یقیناً مستقبل میں ایک تاریخی کارنامہ شمار کیا جائے گا، اس کی بربادی کے تصور سے بھی نیند اڑ جاتی ہے، یاد رکھیے کہ اگر جوہر یونیورسٹی برباد ہوئی تو پھر ہمارے ادارے اور ہماری تنظیمیں بھی محفوظ نہیں، اعظم خاں سے سینکڑوں اختلاف ہو سکتے ہیں اور ان کی ہزاروں غلطیاں بھی ہیں، مگر اس وقت موقع دوسرا ہے، ترجیحات دوسری ہیں، اس وقت جو بھی زبان کھولے گا اس کی فائلیں کھولنے کا کھیل شروع ہو چکا ہے، اعظم خاں ایک قدآور لیڈر تھا، وہ ٹوٹ گیا اور اس کی یونیورسٹی ٹوٹ گئی تو بہت کچھ ٹوٹنے میں دیر نہیں لگے گی، اس لیے اس وقت اس کی حفاظت ملی فریضہ ہے، اس وقت سیاسی اور غیر سیاسی شخصیات کو ہراساں کرنے کا طریقہ یہ اپنایا گیا ہے کہ ہر ایک پیچھے ایجنسیاں لگادی گئی ہیں، اب جس کی کچھ بھی غلطی ہے وہ بولنے اور کچھ کرنے سے قاصر ہے، خواہ وہ غلطی محض الزام ہو یا واقعی غبن، غصب، بے جا استحصال اور اوقاف میں خُرد بُرد حقیقتِ واقعہ ہو، یہی لوگ آئندہ حکومت کے مواقف کے ترجمان بنیں گے، ''وعدہ معاف گواہ کا قاعدہ بہت پرانا ہے''، اس وقت بولنے کی اجازت صرف اس کو ہے جس کا بولنا حکومت کے لیے کارآمد ہے، یہ کبھی یوں کارآمد ہوتا ہے کہ بی جے پی کمیونل چہرے کے طور پر عام ہندوؤں کو دکھاتی ہے، کبھی عالمی منظر نامہ پر اقلیت کے انٹیلکچو ل چہرے کے طور پر استعمال کرتی ہے، بہت سے بولنے والے ہیں، جن کی صبح وشام مخالفت کے باوجود نہ بی جے پی ان پر کان دھرتی ہے، نہ ان کو چھیڑتی ہے اور نہ ملت کو کوئی فائدہ ہی ہوتا ہے، اس وقت ضرورت ہے کہ ایسے تمام لوگوں سے امیدیں توڑ کر سماج کے وہ لوگ میدان میں آئیں جن کی نہ کہیں فائلیں ہوں نہ ان کی دُم دبی ہو، جو کچھ دور چلنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہوں، ایسے لوگ اپنے قائدین سے مل کر مستقبل کا لائحہ عمل بنائیں، **یاد رکھیے اس وقت ایمان اور شریعت پر عمل کے علاوہ تین چیزیں مسلمانوں کو تحفظ فراہم کرسکتی ہیں، ان میں سے پہلی چیز مسلکی عصبیت اور مسلکی تنگیوں سے باہر آکر شریعت کی وسعتوں کو ملحوظ رکھنا، دوسرے تمام لوگوں کا مشترکہ مفادات پر متحد ہونا، تیسرے دیگر اقدامات کے ساتھ سڑک کی لڑائی (Street Fight)، جمہوریت میں رہنے والی اقلیت کے لیے یہ تینوں ہی چیزیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں، اگر ان کی اہمیت کو اب بھی نہ سمجھا گیا تو اگلے چند مہینے بہت اچھی طرح سمجھا دیں گے۔ (اللھم احفظنا من کل شر و مکروہ)**

مودی کے دورۂ اسرائیل کے وقت جب وہ فلسطینی ایک مظلوم بچے سے نہیں ملا تھا تو کچھ عقل کے مارے اس پر واویلا کر رہے تھے، اس وقت ہم نے لکھا تھا کہ ہر ملک اپنی خارجہ پالیسیوں میں اپنے مفادات کو سامنے رکھتا ہے، ہندوستان کی خارجہ پالیسی بھی اپنے مفادات پر مبنی ہوتی ہے، جب تک خلیجی ممالک کی اسرائیل سے دوستی ڈھکی چھپی تھی یا تعلقات مخالفت کے پردہ میں استوار تھے تب تک یہاں کی خارجہ پالیسی میں بھی اسرائیل کو وہ مقام حاصل نہ تھا، جب ذرا تعلقات میں وسعت آئی، سعودیہ میں امریکی فوجی اڈہ قائم ہوا تو ہندوستان میں اسرائیلی سفارت خانہ کھلا، پھر جب سعودیہ وامارات کے اسرائیل سے تعلقات برہنہ ہو کر سامنے آگئے تو ہندوستان کے فرسٹ رینک کے آفیسر اسرائیل ٹریننگ کے لیے جانے لگے، جب ہم نے عرب ممالک کی پالیسیوں پر نقد کیا تو بعض اصحاب دانش کہنے لگے اپنے ملک کے حالات سے بے خبر چلے ہیں دنیا پر تنقید کرنے، ذرا غور کیجیے تو جس تیزی کے ساتھ سعودیہ وامارات کی پالیسیاں بدلی ہیں اور اسرائیل سے تعلقات استوار ہوئے ہیں اسی تیزی کے ساتھ وطن عزیز کے حالات اور پالیسیوں میں تبدیلی آئی ہے، سوچیے ہم جس اسلام کی یہاں تصویر پیش کرتے ہیں اس کے برخلاف مسلم ممالک کا کیا رویّہ ہے اور سعودیہ کس راہ پر چل پڑا ہے، جب سعودیہ کے مفتی عام اسرائیل سے جنگ کو حرام کہیں، حماس کے خلاف متحد ہونے کو ملی فریضہ کہیں، جب سعودی تجزیہ نگار کساب

العتیبی منصوص مسجد اقصیٰ کے تقدس کو پامال کرتے ہوئے اسے محلے کی مسجد قرار دے، جب سعودی بلاگر محمد السعو داسرائیل سے مسجد اقصیٰ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے کی درخواست کرے تو پھر اس ملک کی حکومت جو کچھ کر رہی ہے اس پر تعجب کیسا؟ پارلیمنٹ میں اگر اویسی کو مسلم ممالک کی مثال دی جائے تو تعجب کیسا؟ سعودیہ مودی کو ایوارڈ دے پھر عین اس وقت جب مودی کے ذریعہ کشمیر پر ظلم کے پہاڑ توڑے جارہے ہوں تو دبئی اپنا سب سے بڑا نشان امتیاز دے، مندر کی جگہ دے اور بحرینی وزیر ساتھ میں پوجا کرے تو تعجب کیسا؟ کل تک تو آپ کہتے تھے کہ عرب ممالک کی پالیسیوں پر تنقید کرنا ہی فضول ہے، ہم نے تو پہلے اور بہت پہلے لکھا تھا کہ ہندوستان آج بھی مسلمانوں کے لیے دنیا بھر میں سب سے پرسکون ملک ہے، جس قدر اپنے تشخص کے ساتھ مسلمان یہاں رہتا ہے دنیا کے کسی ملک حتی کہ سعودیہ میں بھی نہیں رہتا ہے، ہم نے لکھا تھا کہ ضرورت ہے کہ اس کے تحفظ کے لیے مناسب اقدامات کیے جائیں کیونکہ یہود جو اسلام کے سب سے بڑے دشمن ہیں ان کو یہ کبھی بھی گوارا نہیں، آخر وہ سب کچھ رفتہ رفتہ آنکھوں کے سامنے ہے، جس تیزی کے ساتھ عربوں کے تعلقات اسرائیل سے بڑھے، اسی تیزی کے ساتھ ہند-اسرائیل دوستی میں اضافہ ہوتا گیا، اس وقت وہ اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے، اور اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسی دوستی اور سرپرستی کا نتیجہ ہے، کیونکہ نسل پرست کی دوستی نسل پرست سے ہی ہوسکتی ہے اور قرآن مجید کی زبان میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے وہ کچھ یہی کہانی سناتی ہے لتجدن اشد الناس عداوة للذين اٰمنوا والذين اشركوا۔ (مائدہ۸۲)

یہ باتیں میں نے اس لیے لکھی ہیں اور ان کی فوری اہمیت اس لیے ہے کہ ابھی یکے بعد دیگرے کئی قوانین میں ترمیم کی تیاری ہے، سب سے اہم ترمیم سوسائٹی ایکٹ سے متعلق ہے، کسی بھی قوم کی کمر توڑنے اور اس کی ترقی پر قدغن لگانے کا آسان طریقہ ہے کہ اس کی تنظیموں کو ختم یا محدود کر دیا جائے، اگر تنظیموں پر ہاتھ ڈالا گیا تو صرف ہمارا اتحاد ہی ہمیں بچا سکتا ہے، جس طرح مختلف فیہ مسائل میں ہاتھ ڈالا گیا تو صرف شریعت کی وسعتیں ہی تحفظ فراہم کر سکتی ہیں کیونکہ یکے بعد دیگرے مسائل کھڑے کرنے کی مکمل تیاری ہے۔

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ یہ وقت ہے رجوع وانابت الی اللہ کا، شریعت کو گلے لگانے کا یہ وقت ہے اتحاد امت کا، اپنی روش کو بدلنے اور اپنے رویّہ کو درست کرنے کا، اب بالکل بھی وقت نہیں بچا ہے، اگر اب بھی کوئی خاکہ اور لائحہ عمل نہ تیار کیا گیا تو اس ملک میں آئندہ طویل عرصہ تک ہماری نسلیں غلام ہوں گی، یہ سجدہ ریز ہونے کی نادانی کرنے کا وقت نہیں بلکہ وقتِ قیام ہے، فکر وعمل کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو قبول کرتے ہوئے صحیح سمت سفر طے کرنے کا وقت ہے، آپ نے اس ملک میں رہنے کا فیصلہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ کیا ہے، یہ ملک کسی کی جاگیر نہیں ہے، یہ ملک آپ کا ہے، آپ سینہ تان کر رہیے، ملک کے دستور کی رعایت اور پاسداری کیجئے، آپ اقلیت میں ضرور ہیں مگر اپنے تشخص کے ساتھ رہیے، کیونکہ قرآن کریم کی نظر میں اقلیت واکثریت کا فلسفہ بے معنی ہے، اکثریت کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے: ولن تغنی عنکم فئتکم شیئا ولو کثرت (انفال۱۹) ''اور تمہارے جتھے کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں کام نہیں آئیں گے''، طالوت وجالوت کے واقعہ میں اہل ایمان کا قول نقل کیا گیا ہے: کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة (بقرہ۲۴۹) ''کتنے چھوٹے گروہ اللہ کے حکم سے بڑے بڑے گروہوں پر غالب آجاتے ہیں''، جنگ احزاب کے موقع پر جب باطل اپنے پورے لاؤلشکر کے ساتھ ایک بڑا الائنس (اتحادی فوجیں) لے کر مدینہ پر چڑھ آیا تھا تو مومنین نے جو کچھ کہا اسے قرآن نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے: وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَاناً وَتَسْلِيماً (احزاب۲۲) ''اور جب ایمان والوں نے لشکروں اور جتھوں کو دیکھا

تو کہنے لگے، ہاں اسی کا وعدہ ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے کیا تھا، اور اللہ نے اور اس کے رسول نے سچ کہا تھا، اور اس صورت حال نے ان کے ایمان اور تسلیم و رضا میں اور اضافہ کر دیا''، اس لیے آپ کو مخالفین کے پروپیگنڈوں سے بالکل مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں، دشمن کی یہ چال پرانی ہے، دشمن نے ہمیشہ نور خدا کو منہ کی پھونکوں سے بجھانے کی سعی لاحاصل کی ہے، مگر یہ کوشش ہمیشہ رائیگاں گئی ہے، بس شرط یہ ہے کہ آپ اپنا قبلہ درست کر لیں، ہمارے درمیان سے جو لوگ سجدہ ریز ہونے کو تیار ہیں، جو ہمت توڑنے اور حوصلوں کو پست کرنے کا کام کر رہے ہیں قسم بخدا نہ ان کے سامنے مکہ مکرمہ کی تاریخ ہے اور نہ سیرت نبوی کا کردار و منہج، ان کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اگر ایک بار کسی قوم کے حوصلے پست ہو گئے تو پھر کئی نسلیں غلامی کا طوق نہ اتار سکیں گی، اگر آپ اقلیت میں ہیں تو مکہ کی اقلیت کو دیکھیے، اگر حالات پر خطر ہیں تو مکہ کی اقلیت کو درپیش خطرات پر نظر ڈالیئے، دیکھیے کیا وہ اقلیت پروپیگنڈوں سے متاثر ہوئی تھی، کیا وہ مرعوبیت کا شکار ہوئی تھی، دیکھیے کہ رب کریم نے کس طرح حکم دیا اور کیا کرنے کو کہا:

فرمایا سورہ نحل میں: وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ۔ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ۔

(اور صبر سے کام لیا کرو، (حق پر جمنے اور باطل سے دور رہنے کی مشق رکھنا چاہیے) اور یہ صفتِ صبر اللہ ہی کے فضل سے نصیب ہوتی ہے، اور ان (نہ ماننے والوں) پر غم کھانے کی ضرورت نہیں ہے، اور ان کی سازشوں سے دل تنگ نہیں کرنا ہے (مناسب اقدامات کرنے ہیں اور اللہ پر بھروسہ رکھنا ہے) اللہ پرہیزگاروں اور نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔) (سورہ نحل ۱۲۷-۱۲۸)

سورہ روم میں اسی صبر کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ اپنے مشن پر جمے رہیں، یہ کافر و مشرک قطعاً آپ کو اپنے مقام و مشن سے نہ ہٹا سکیں۔ فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِينَ لَا يُوقِنُونَ۔

(تو آپ صبر کرتے رہیں، اللہ کا وعدہ برحق ہے، اور یہ بے ایمان کسی غلط اقدام پر آپ کو نہ اکسا سکیں اور نہ آپ کے قدم اکھاڑ سکیں۔) (سورہ روم ۶۰)

سورہ انعام جو مکمل مکہ میں نازل ہوئی اس میں مزید صراحت کے ساتھ حکم دیا کہ آپ ان مشرکین اور دشمنانِ اسلام کی خواہشات پر توجہ نہ دیجئے بلکہ ان سے برأت کا اعلان واضح لفظوں میں کیجئے، پہلے ہی آپ کو مکہ کے پرخطر اور کسمپرسی کے عالم میں جہاد بالقرآن کے ذریعہ اتمام حجت کا حکم دیا گیا تھا، بار بار قرآن کے ذریعہ ڈرانے کا حکم دیا گیا، اور یہاں آپ کو مکہ کی جاہل، متعصب، تنگ نظر، دشمن خدا اور دشمن دین و ایمان اور دشمن جان سخت گیر اکثریتی آبادی کے سامنے اس طرح اعلان کرنے کا حکم دیا گیا:

قُلْ إِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ قُل لا أَتَّبِعُ أَهْوَاءَكُمْ قَدْ ضَلَلْتُ إِذًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُهْتَدِينَ۔

''ان سے کہہ دیجئے کہ مجھے منع کیا گیا ہے کہ ان معبودان باطل کی عبادت کروں جن کو اللہ کو چھوڑ کر تم پکارتے ہو، کہہ دیجئے کہ میں تمہاری خواہشات کی پیروی کرنے والا نہیں، اگر میں ایسا کروں تو میں گمراہ ہو جاؤں گا اور ہدایت سے محروم ہو جاؤں گا''۔ (سورہ انعام ۵۶)

اور اسی سورہ میں اسلوب بدل کر یہی بات کہلائی گئی:

قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَى وَأُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ۔

''صاف کہہ دیجئے کہ اللہ کی ہدایت اور اللہ کا بتایا ہوا طریقہ ہی صرف صحیح طریقہ ہے اور ہمیں حکم ہے کہ ہم رب العالمین کے سامنے جھک جائیں''۔(انعام ۷۱)

جب خدا کے مشن پر ثابت قدمی دکھائی جائے گی تو پھر خدا کا ساتھ ملے گا، اس طرح ہے، غیر اللہ کی نفی کرتے ہوئے اس طرح بشارت دی گئی ہے: إِنَّ وَلِيِّيَ اللّهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتَابَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِيْنَ۔ وَالَّذِيْنَ تَدْعُونَ مِن دُونِهِ لَا يَسْتَطِيْعُونَ نَصْرَكُمْ وَلا أَنفُسَهُمْ يَنْصُرُون۔

(میرا ساتھ دینے والا، میرا کارساز اللہ ہے، جس نے کتاب نازل فرمائی، اور وہ نیک اور صالح لوگوں سے تعلق رکھتا ہے اور ان کے مسائل حل فرماتا ہے، اور اس کے علاوہ تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری مدد نہیں کر سکتے، اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں)۔ (سورہ اعراف ۱۹۶-۱۹۷)

اللّهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ آمَنُواْ يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُواْ أَوْلِيَآؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ أُوْلَـئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُونَ۔

(اللہ ایمان والوں سے محبت فرماتا ہے، وہ انھیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے، اور جو کافر ہیں ان کے دوست طاغوت ہیں (طاغوتی نظام اور طاغوتی طاقتیں، جو حق سے برسر پیکار ہیں) وہ انھیں (حق، دین، شریعت الٰہی) کی روشنی سے نکال کر (کفر والحاد، لادینیت واباحیت کی) تاریکیوں میں جھونک دیتی ہیں، یہ دوزخی ہیں، اسی میں یہ ہمیشہ رہیں گے۔) (سورہ بقرہ ۲۵۷)

کار دعوت کو انجام دینے، خدا کے فیصلوں پر جمنے اور مضبوطی کے ساتھ مشن پر لگے رہنے کا حکم دیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ فرمایا گیا کہ لوگوں کو ظالموں کی تائید ونصرت تو دور اُن کی طرف میلان بھی نہ رکھنا چاہیے ورنہ انھیں آگ جلا کر راکھ کر دے گی، عذاب الٰہی اپنی گرفت میں لے لے گا، اگر ظالموں کی طرف رجحان ومیلان اس گمان میں ہو کہ ان سے کچھ مفادات حل ہو جائیں گے اور کچھ کام بن جائیں گے تو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ کارساز وچارہ ساز صرف اور صرف خدائے وحدہٗ لاشریک ہے، ظالموں کے بس میں کچھ نہیں۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَن تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْاْ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيْرٌ، وَلَا تَرْكَنُواْ إِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُواْ فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللّهِ مِنْ أَوْلِيَاء ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ (سورہ ہود ۱۱۲-۱۱۳)

''بس آپ کو جس طرح مامور فرمایا گیا ہے آپ اس پر مضبوطی سے قائم رہیں، اور جو آپ کے ساتھ شرک وکفر کے بعد توبہ کر کے شامل ہیں (وہ بھی استقامت سے جمے رہیں) اور کوئی سرکشی نہ ہونے دیں، اللہ آپ سب کے عمل سے خوب واقف ہے، (اے لوگو!) ظالموں اور بدکرداروں کی طرف میلان بھی اختیار نہ کرنا، ورنہ آگ تم کو جلا دے گی، اور اللہ کے علاوہ تمہارا کوئی کام نہیں بنا سکے گا، اور نہ تمہیں کوئی مدد ملے گی''۔

☆

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی)

❑ پیامِ سیرت

محبت کی انوکھی مثال

محمد فرید حبیب ندوی

''میں یہ مبارک خون کیسے پھینک دیتا!''

دنیا نے محبت ووارفتگی کی بڑی بڑی مثالیں دیکھی ہوں گی۔ تاریخ نے عشق وجنوں کے انوکھے انوکھے واقعات نقل کیے ہوں گے۔

آپ نے بھی شیریں وفرہاد، لیلی ومجنوں اور جمیل وبثینہ کے پاگل پن کی کہانیاں سنی ہوں گی۔

مگر آج محبت ودیوانگی کی ایک نئی تاریخ رقم ہورہی تھی۔

ایسی تاریخ.....جس پر.....صدیوں زمانہ فخر کرے گا۔

ایسی تاریخ.....جس کی حرارت.....مدتوں قلب کو گرماتی رہے گی۔

ایسی تاریخ.....جو پڑھی جائے گی تو زبان اُس پر اپنے کو قابل رشک سمجھے گی۔.....جو دیکھی جائے گی تو آنکھیں اس پر فخر کا اظہار کریں گی۔.....جو سنی جائے گی ،تو کان احساسِ برتری میں مبتلا ہوجائیں گے۔

جی ہاں.....ایسی تاریخ.....جس کے سننے والے، نہ سننے والوں پر.....دیکھنے والے، نہ دیکھنے والوں پر.....پڑھنے والے، نہ پڑھنے والوں پر.....فخر ومباہات کریں گے۔

جو بقعۂ زمین اس کا شاہد بنے گا.....وہ زمین کے دوسرے خطوں پر فخر کرے گا۔

جو ساعتِ ہمایوں اس کی گواہ ہوگی.....وہ گردشِ لیل ونہار پر بڑائی جتائے گی۔

اُحُد کا میدان ہے.....رسول پاک علیہ السلام زخمی ہیں.....چہرۂ انور اور پیشانی مبارک خون آلود ہے.....رخسار مبارک میں زرہ کے دوکڑے پیوست ہوگئے ہیں.....آپ چور چوراور نڈھال ہیں۔

مجھے لگتا ہے شاید رب دوعالم نے .....میدانِ احد میں حبیبِ دوجہاں کو جو زخمی کروایا.....تو دراصل وہ اپنے حبیب کے جاں نثاروں کی محبت ودیوانگی کے نقوش، اگلی نسلوں تک منتقل کرنا چاہتا تھا۔

ورنہ کیا ضرورت تھی دنیا کے سب سے قیمتی انسان کے .....سب سے مبارک بدن کے.....سب سے گراں قدر..... قطرہائے خون اور اشک ہائے چشمِ مبارک گروانے کی۔

وہ چاہتا تو اس کے گرد فرشتوں کا ایک ہالہ بنادیتا.....اور دشمن اس تک رسائی پانے سے محروم رہ جاتے۔

وہ ایک طرف اپنے حبیب کے درجات کو بلند کرنا چاہتا تھا.....اور دوسری طرف.....شمع کے پروانوں کی محبت وخود سپردگی کے نمونے پیش کروانا چاہتا تھا۔

اور دنیا نے دیکھا کہ جیسی فریفتگی وخود سپردگی.....جیسی جاں نثاری ودیوانگی.....جیسی محبت ووارفتگی.....شمعِ رسالت کے پروانوں نے دکھائی.....اس کی مثال پیش کرنے سے دنیا پہلے بھی عاجز رہی اور آج بھی عاجز ہے۔

آج بھی ایسی ہی ایک مثال تاریخ میں درج ہورہی

تھی.....اُن کا ایک دیوانہ عاشق ایک نئی تاریخ رقم کر رہا تھا۔

رسول پاک علیہ السلام کی جبینِ مبارک سے خون رِس رہا تھا.....اُس کی نظر پڑی تو بے خود ہو گیا.....اپنے ہونٹ آپ کی پیشانی سے مس کیے اور بہنے والے خون کو چوس لیا۔

دیکھنے والے دم بخود رہ گیے جب انھوں نے دیکھا کہ اُس دیوانے عاشق نے.....کلی کرنے کی بجائے.....وہ خون حلق سے نیچے اتار لیا۔

''ارے!.....تم نے یہ خون نگل لیا!.....کلی کیوں نہ کر دی؟''

کہنے والوں نے حیرت واستعجاب سے کہا۔

'' میں رسول خدا ﷺ کے خون کو زمین پر کیسے پھینک دیتا!.....مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا تھا''۔

وہ تھے ہی ایسے.....بڑے خاص لوگ تھے وہ.....انھیں خدا نے اپنے حبیب کی صحبت کے لیے خاص طور سے چنا تھا۔

جو اپنے محبوب کے بدن سے گرنے والے وضو کے پانی کے قطرے زمین پر نہ گرنے دیتے ہوں.....وہ اس کے خون کو زمین پر کیسے بہا دیتے!

جو اس کے تھوک اور لعاب کو اپنے بدن پر ملنے کے لیے.....آپس میں کھینچا تانی کرتے ہوں.....وہ جان بوجھ کر اس کے لہو کے قطرے زمین پر کیسے گرا دیتے!

سچی بات یہ ہے کہ ہم ان کی محبت کی گہرائی کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔

ہم ان کے جذبات کی تھاہ تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔

وہ بے نظیر تھے.....بے مثال تھے.....لا جواب تھے۔

وہ اپنے محبوب کے پاگل دیوانے تھے.....عاشق مستانے تھے۔

ان کی زندگی.....اس کی محبت سے شروع ہو کر.....اس کی محبت پر ہی ختم ہوتی تھی۔

ان کی کائنات کا محور.....تنہا اس کی ذات تھی۔

وہ جیتے تھے تو اس کے لیے.....مرتے تھے تو اس کے نام پر۔

وہ شہنشاہوں کے بھرے دربار میں ہوں.....یا خلوت کے حجروں میں۔

دنیاوی زیب وزینت سے سجے بازار میں ہوں.....یا مسجد کے منبر ومحراب میں۔

ان کے سر تلوار کی جھنکار کے زیر سایہ ہوں.....یا خدائے واحد کے آگے جھکے ہوئے۔

وہ کہیں بھی ہوں.....اپنے محبوب کو نہیں بھولتے۔

اس کی یاد سے کہیں غافل نہیں ہوتے۔

اس کی محبت کے تقاضوں سے کہیں انحراف نہیں کرتے۔

وہ اس کے لیے جان لے بھی سکتے ہیں اور جان دے بھی سکتے ہیں۔

وہ اس کے ایسے ہی دیوانے تھے۔

یہ واقعہ جو اوپر مذکور ہوا.....ایسے ہی ایک دیوانے کی کہانی ہے۔

یہ کوئی اور نہیں.....مشہور صحابی حضرت ابو سعید خدریؓ کے والد گرامی حضرت مالک بن سنانؓ ہیں۔

لہو کے چند مبارک قطرے پی کر انھوں نے جو تاریخ رقم کی ہے.....تاریخِ محبت وعشق ہمیشہ اسے یاد رکھے گی۔

آج ہم بھی انھی کے نام لیوا ہیں.....انھی کے پیرو کہلاتے ہیں.....دنیا ہمیں انھی کے وارث کی حیثیت سے جانتی ہے.....مگر.....کیا اِس محبت کا کوئی ذرہ ہمارے اندر بھی موجود ہے؟

جب تک رسول پاک علیہ السلام سے اندھی عقیدت ومحبت.....جذباتیت اور دیوانگی کی کیفیت پیدا نہیں ہوگی.....ہم صحیح معنی میں ان کے جانشین نہیں ہو سکتے۔

آج سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ ہم رسول پاک ﷺ سے بھی عقلی اور منطقی محبت کرتے ہیں.....اس میں جذباتیت وپاگل پن نہیں ہے.....اس میں دیوانگی ووارفتگی نہیں ہے۔

ضرورت ہے کہ ہم بھی مالک بن سنانؓ کی جیسی محبت کی لَو اپنے اندر جلائیں اور اپنے اندر کی دنیا آباد کریں۔

☆☆☆

❑ خاص تحریر

قسط-۱

عالم عربی کی صورت حال-احادیث نبوی کی روشنی میں

مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
ناظم تعلیمات، دارالعلوم امام ربانی، نیرل

اس وقت پوری دنیا میں مسلمان ایک عجیب صورت حال سے دوچار ہیں، عالم اسلام یا تو کشت خون سے لالہ زار ہے، یا عالمی سازشوں کے شکنجۂ استبداد میں جکڑ چکا ہے، اور ایسا لگتا ہے کہ عالمی طاغوتی قوتوں نے فکر عرب کو فرنگی تخیلات کے سانچے میں ڈھال کر روح محمد کو اس طرح اہل اسلام کے قلب ونظر سے نکال دیا ہے کہ بالخصوص عالم اسلام اب ''وہ صاحب اوصاف حجازی'' نہ رہا۔ ایک طرف فکری وتہذیبی یلغاروں نے عالم اسلام کو فکری ارتداد کا راستہ دکھایا، اور دوسری طرف ان کی عسکری وسیاسی قوت نے آتش وآہن کے ذریعہ اس کو جہنم کدہ بنا دیا۔ اس صورت حال نے کفر ونفاق کے ساتھ مودت کی راہیں کھول دیں، اور دیار اسلام میں پرچم کفر لہلہانے لگا، اسلام کی مغربی تشریح میں کعبہ وبت خانہ، صلیب وہلال ایک قرار دئے گئے، ''جدید اسلام'' کے زیر سایہ ایسی فکر گستاخ وجود میں آئی جہاں نام نہاد اسلام کے پرستار یہود ونصاری سے تو بغل گیر ہوگئے مگر حقیقی اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں اور فکر اسلامی کی بالادستی کا جذبہ رکھنے والوں کے لئے انہوں نے اپنے دروازے بند کر لئے،، اور یہ جگر خراش حالت ہوگئی کہ مغربی اسلام والے حقیقی اسلام کے دشمن بن گئے، بلکہ نام نہاد اسلامی ممالک اس عہد کشمکش میں اسلام پسندوں کے مقتل وتعذیب خانے بن گئے، اسلامی ممالک کے ذخائر اور ان کے اموال ودولت اسلام اور اہل اسلام کی بیخ کنی کرنے والوں کے ہاتھ کا کھلونا قرار پائے، مگر ان کے خزانہ میں مظلومیت کی خاک پر لوٹنے والے اہل اسلام کے لئے ایک حبہ ودانہ نہیں ملتا۔ یہ سب خدا کی زمین پر آسمان کے نیچے کیا ہو رہا ہے؟ افغانستان کو تاراج کر دیا گیا، عراق کو آگ وخون میں ڈبو دیا گیا، ملک شام کو ایسا لالہ زار بنایا گیا کہ موج خوں اور آگ کے دریا میں صرف انسانی لاشیں دکھائی دیتی ہیں، یمن میں بستیاں کی بستیاں اجاڑ دی گئیں، سرزمین انبیاء، ارض مبارک شہر فلسطین لاکھوں انسانوں کا مقتل بن گیا، اور عالمی استعماری قوتوں کے سہارے یہودی ناجائز ریاست وہاں قائم ہوگئی، مصر کی زمین اسلام پسندوں کے لئے نئے فرعونی ستم کا نمونہ بن گئی، سرزمین حجاز میں ''بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں'' کا نظارہ ہے۔ حالات کا یہ رخ دیکھ کر کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے، دل بیٹھا جاتا ہے، کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے، خدا کی زمین خدا کے بندوں پر کیوں تنگ ہوگئی؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی مواقع ومناظر ہوتے ہیں جہاں عشق کا امتحان اور ایمان کی آزمائش ہوتی ہے۔ بندہ مومن کی شان اور ذوق سے ممکن نہیں کہ وہ اس جیسے حالات میں ہراساں وپریشان ہو۔ اسے زیب نہیں دیتا کہ وہ طوفانی ہواؤں، اور برق وباراں کی آواز سے سہم جائے، بلکہ وہ اپنی استقامت وصلابت سے پہاڑوں کو شرمانے کا حوصلہ رکھتا ہے، اپنے یقین واعتماد کو نہ متزلزل ہونے دیتا ہے اور نہ ہی ہمت ہارتا ہے، بلکہ اس کا ضمیر اس سے یہ کہتا ہے کہ:

کانپتا ہے دل ترا اندیشہ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو

قرآن مجید میں ایسے ہی مردان کار کے لئے بیان کیا گیا ہے " وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَاناً وَتَسْلِيماً" جب اہل ایمان نے اپنے خلاف لشکروں کو صف آراء دیکھا تو تو بیساختہ کہنے لگے: اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے اسی معرکہ آرائی کا وعدہ کیا تھا، اور واقعی اللہ اور اس کے رسول کا وعدہ قطعی برحق تھا، ان حالات سے ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہی ہوا"۔

حالات کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہ سب کیوں ہوا؟ اس کے پیچھے کیا عوامل وعناصر ہیں؟ یہ بھی گہرے مطالعہ اور سنجیدگی کا موضوع ہے، میں اپنے بعض مضامین میں اس کا کچھ تجزیہ ذکر کر چکا ہوں اور مختلف اہل علم وقلم ذکر کرتے رہتے ہیں، لیکن ہم اس وقت اس پہلو سے جائزہ لیتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے لئے نیا نہیں ہے، پیغمبر آخر الزماں محمد ﷺ نے ہمیں اس کا شارہ کر دیا تھا، ہمیں آگاہی دی تھی کہ کیا ہونے والا ہے۔ حالات کا یہ رخ ہمارے لئے نہ تعجب خیز ہے اور نہ ہی اس کی خطرناکی ہمارے لئے ہوشربا ہے، ہمارا ایمان ہے کہ حق وباطل کی رزم گاہ اور ایمان وکفر کی معرکہ آرائی میں یہ حالات ماضی میں بھی آئے ہیں، اور اب بھی آرہے ہیں، مستقبل میں بھی آئیں گے، اور اس معرکہ آرائی میں مخلص ومنافق کی چھٹائی ہوتی رہے گی، ایمان واہل ایمان بہر حال غالب ہوں گے، کفر ونفاق کی تلچھٹ خاکستر ہو کر ختم ہوگی، یہ نوشتہ تقدیر ہے، اور فیصلہ خداوندی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے صحابہ کے سامنے آنے والے دور کی ہلکی سی تصویر مختلف انداز سے پیش فرمائی تھی، فتنوں کا تذکرہ فرمایا تھا، اور مستقبل کی پیشین گوئیاں فرمائی تھیں، احادیث فتن حالات کے رخ اور مصائب ومحن کو سمجھنے کا ایک بہت اہم ذریعہ ہیں، آنحضرت ﷺ نے قیامت تک پیش آنے والے تمام فتنوں کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔

صحیح مسلم میں حضرت حذیفہؓ کی حدیث منقول ہے:

"قام فينا رسول الله ﷺ مقاما، ماترك شيئا يكون فى مقامه ذلك الى قيام الساعة الا حدث به، حفظه من حفظه ونسيه من نسيه" حضرت حذیفہؓ فرماتے کہ حضور ﷺ نے ایک دن ہمارے درمیان خطاب فرمایا، اور اس دن قیامت تک آنے والے ہر فتنہ کا تذکرہ کیا، پس جو یاد رکھ سکا اس کو یاد رہ گیا، جو یاد نہیں رکھ سکا وہ بھول گیا" یہ خطاب اتنا طویل تھا اور تفصیلی تھا کہ ساری تفصیل اور جزئیات ہر شخص یاد نہیں رکھ سکا۔

صحیح مسلم کی ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک طویل خطاب فرمایا تھا، حضرت ابوزید عمرو بن اُخطب سے منقول ہے: "صلى بنا رسول الله ﷺ الفجر، وصعد المنبر، فخطبنا حتى حضرت الظهر، فنزل وصلى، ثم صعد المنبر فخطبنا حتى حضرت العصر، ثم نزل فصلى، ثم صعد المنبر فخطبنا حتى غربت الشمس فأخبرنا بما كان وما هو كائن، فأعلمنا أحفظنا" فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ایک دن فجر کی نماز پڑھائی، منبر پر تشریف فرما ہوئے، خطاب فرمایا یہاں تک کہ ظہر کا وقت ہو گیا، ظہر کی نماز پڑھائی، پھر منبر پر تشریف فرما ہوئے، اور خطاب فرمایا یہاں تک کہ عصر کا وقت ہو گیا، عصر کی نماز پڑھائی، پھر منبر پر تشریف فرما ہوئے، اور خطاب فرمایا یہاں تک کہ غروب کا وقت ہو گیا، اس دن آپ ﷺ نے آنے والے حالات اور فتنوں کے بارے میں بتایا، پس جس نے اس تفصیلی خطاب کو یاد رکھا وہ ہم میں سب سے زیادہ بڑا عالم تھا"۔

بلکہ ایک روایت میں یہ بھی تفصیل ہے کہ قیامت تک آنے والے فتنے اور فتنہ پرور، فتنہ وفساد کے سرغنہ اور لیڈروں کا آپ ﷺ نے ذکر فرمایا، سنن ابوداؤد میں حضرت حذیفہ سے منقول ہے: "والله ماترك رسول الله ﷺ من قائد فتنة الى أن تنقضى الدنيا يبلغ من معه ثلاثمأة فصاعدا الاقد سماه لنا باسمه وباسم أبيه واسم قبيلته" حضرت حذیفہ بن الیمان فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم حضور ﷺ نے قیامت تک پیدا ہونے والے ہر ایسے فتنہ پرور کا ذکر کیا جس کے ماننے

والے تین سو کی تعداد میں بھی ہوں، اور ہمیں اس کا نام، اس کے باپ کا نام اور اس کے قبیلہ تک کا نام بتایا''۔

یہ اعجاز نبوی تھا کہ آپ ﷺ نے عالم الغیب والشھادہ کی جانب سے امت کو آگاہ کر دیا تھا، کیا فتنے ہوں گے، کون فتنہ پرور ہوں گے، فتنوں کی نوعیت اور ان کے مقامات کیا ہوں گے۔ اس کی حکمت کیا تھی کہ قیامت تک کے فتنوں کی نشاندہی اور پیشین گوئی کر دی جائے، اس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، تاہم ایسا لگتا ہے کہ مشیت ایزدی تھی کہ نبی آخر الزماں کی زبان حق ترجمان سے امت کو آگاہ کر دیا جائے تا کہ امت کے افراد قیامت تک ان فتنوں کو پہچان کر ان سے اپنے دین وایمان کی حفاظت بھی کرتے رہیں، اور فتنوں کے اچانک رونما ہونے پر گھبرانے اور بے چین ہونے کے بجائے وہ استقامت کے ساتھ رہتے ہوئے یہ کہہ سکیں کہ یہ سب ہمارے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے، ہمارے نبی نے ہم کو اس کے بارے میں بتایا تھا۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ احادیث فتن میں اشاراتی زبان ہے، آنحضرت ﷺ نے فتنوں کے اشارے ذکر فرمائے ہیں، ان میں عمومی فتنے بھی ہیں خصوصی بھی ہیں، قیامت کی بڑی نشانیوں کا تذکرہ بھی ہے اور قیامت سے پہلے پیش آنے والے ان حالات کا اشارہ بھی جن کے بعد اشراط الساعۃ الکبری یعنی قیامت کی بڑی نشانیاں عین قرب قیامت میں ظاہر ہوں گی، مثلا دجال اکبر قیامت سے پہلے ظاہر ہوگا، اور حضرت عیسی ابن مریم کے ہاتھوں مارا جائے گا، مگر اس سے پہلے بہت سے دجال رونما ہوں گے، دجالی صفات کا ظہور ہوگا، دجالی قوت، دجالی مکر وفریب اور سازش وفتنے پیدا ہوں گے۔ یہ سب بھی احادیث فتن سے معلوم ہوتا ہے۔ اس ضمن میں فتنوں اور حالات کو احادیث کی روشنی میں سمجھا تو جا سکتا ہے، مگر قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں حدیث کی مراد سو فیصد یہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ احادیث فتن کا عصر حاضر کے فتنوں پر انطباق کرنا بھی کوئی آسان اور سہل کام نہیں ہے، بلکہ گہرے غور وفکر کا محتاج ہے، میرے نزدیک احادیث فتن کے اشاروں میں ہم عصر حاضر کے رخ کو سمجھ سکتے ہیں، اور یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ہم خود کس مقام پر کھڑے ہوئے ہیں، حدیث نبوی کے قطب نما کا اشارہ کدھر ہے، اس لئے ہم اپنے اس مضمون میں یہ تو دعوی نہیں کر سکتے کہ ہم نے جو سمجھا وہی سو فیصد حق ہے، اور حالات وفتن کا مکمل وگہرا تجزیہ ہم یہاں پیش کر رہے ہیں، ہاں البتہ عصر حاضر کے حالات بالخصوص عالم اسلام کے حالات اور امت اسلمہ کی عمومی حالت کو چند احادیث کی روشنی میں بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔

احادیث فتن سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ آخری دور میں بنیادی طور فتنوں کا مرکز سرزمین فلسطین، شام وعراق اور شرق اوسط کا خطہ ہوگا، بھیانک ترین قتل وقتال، خونریزی اور سیاسی واخلاقی، سماجی واقتصادی فتنے ہوں گے، جن کے اثرات پوری دنیا پر مرتب ہوں گے، ان فتنوں اور جنگ وجدال میں اہل حق کی جماعت اور اس کی جد وجہد، کشمکش اور ان کی جگہ کا اشارہ بھی روایات میں ملتا ہے، عالم عربی خاص طور پر اور مسلمانان عالم عمومی طور پر کن فتنوں سے دوچار ہوں گے، کن مصائب وآلام سے دوچار ہوں گے۔ آج ہم عالم عربی کی جو سیاسی، اخلاقی اور سماجی ابتری دیکھ رہے ہیں، احادیث فتن میں اس کے شارے ذکر کئے گئے ہیں، ہم ذیل میں مختصراً ذکر کرتے ہیں۔

(۱) عرب کی تباہی:

صحیحین میں ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی حدیث مذکور ہے، ام المؤمنینؓ سے منقول ہے فرماتی ہیں:

''أن النبی ﷺ صلی الله علیه وسلم دخل علیها فزعا وهو یقول:لااله الا الله، ویل للعرب من شر قد اقترب، فتح الیوم من ردم یأجوج ومأجوج مثل هذه، ،حلق بإصبعیه،الابهام والتی تلیها، فقلت یارسول الله! أنهلك وفینا الصالحون؟ قال : نعم اذا كثر الخبث''(متفق علیہ)

فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ ایک دن میرے پاس تشریف لائے، آپ کے چہرہ انور پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں تھے، آپ

ﷺ فرمارہے تھے،اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، عربوں کی تباہی وہلاکت اس فتنہ سے جو بہت قریب آچکا، آج یأجوج مأجوج کی دیوار کا اتنا سا سوراخ کھول دیا گیا، آپ ﷺ نے اپنی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کا حلقہ بنا کر دکھایا، میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ کیا ہم ہلاک ہوجائیں گے، اس حال میں کہ ہمارے درمیان صالحین موجود ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں ، جب خباثت وبرائی زیادہ ہوجائے گی''۔

اس حدیث میں عربوں کی تباہی اوران کے لئے یاجوج مأجوج کے خطرات سے آگاہی دی گئی ہے، حضرت ام المؤمنین ؓ نے فورا یہ سوال کیا کہ کیا ہم لوگ ''صالحین'' کی موجودگی میں ہلاک ہوجائیں گے، انہوں نے یأجوج مأجوج کی حقیقت، یاان کی آمد کے وقت اوران کے ذریعہ ہونے والی تباہی کا سوال نہیں کیا، اس لئے کہ آپ ﷺ کی پیشین گوئی کے بعد انہیں پکا یقین تھا کہ یہ تباہی تو آکر ہی رہے گی، وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ معاشرہ میں صالح افراد کا وجود، تعلق مع اللہ، خیر وصلاح کا مزاج، اور حسن کردار وعمل ہی ہلاکت سے بچانے کا بنیادی سبب ہوتا ہے، سوال یہ تھا کہ کیا اس کے باوجود ہلاکت یقینی ہے؟ آپ ﷺ نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے فرمایا، جی ہاں؛ جب خباثت وبدعملی زیادہ ہوجائے گی، یقیناً عمومی فساد وبگاڑ کے وقت، اور معاشرہ میں پھیلے ہوئے عمومی شر وخباثت کی موجودگی، اوراجتماعی منکرات کے وقت انفرادی خیر وصلاح نہیں بچا سکتا، جس طرح طوفانی وطغیانی موجوں کے درمیان ٹوٹی بادبانی کشتیاں غرقاب ہونے سے نہیں بچاسکتیں، اسی طرح شرور ومنکرات، اور فتنہ وفساد کی خطرناک موجوں میں گھرے معاشرہ کو اکا دکا افراد کی صلاح ونیکی ہلاکت کے مہیب انجام سے نہیں بچاسکتی۔

اس روایت میں چند بہت قابل غور اشارے ہیں، پہلی بات تو یہ کہ عربوں کی تباہی وہلاکت کے لئے یاجوج ماجوج کا خطرہ ذکر کیا گیا ہے، یہ بہت اہم حقائق اپنے اندر رکھتا ہے، یاجوج ماجوج کے تعلق سے عمومی رجحان یہ ہے کہ وہ ذوالقرنین کے زمانہ میں کوئی فسادی مخلوق تھی، اس کے شر سے انسانوں کو بچانے کے لئے اس نے ''سد سکندری'' تعمیر کی تھی، یا یہ کوئی ایسی مخلوق ہے جو قرب قیامت میں ظاہر ہوگی، اور فساد عظیم برپا کرے گی، یقیناً وہ ماضی میں ہوا اور یہ مستقبل میں اللہ کو معلوم ہے کہ کب ہوگا اور کیا ہوگا، ماضی میں ان کا نشانہ عرب نہ تھے، اور قرب قیامت میں صرف عرب نہیں بلکہ عموما تمام انسانی اقوام اور خصوصا اہل اسلام ہوں گے، یہاں ان کے ہاتھوں عربوں کی تباہی کا اشارہ کیا ہے؟

یأجوج مأجوج صرف کوئی ماضی کی داستان یا قرب قیامت میں ظاہر ہونے والی کوئی قوم ہی نہیں ہے، بلکہ یہ وہ لوگ مراد ہیں جن کا خمیر ظلم وفساد ہے، کشت وخون ان کی سرشت ہے، جنگ وجدال، اورانسانوں کی ہلاکت ان کا مزاج ہے، یہی ان کے نام سے ظاہر ہے، وہ اسم بامسمی ہیں، چوں کہ ان کے نام کا مطلب ہی ہے ''آگ بھڑکانے والی قوم''، اس طرح کی اقوام ہر زمانے میں رہی ہیں، جن کے منہ کو انسانی خون لگا ہوا تھا، وہ صرف اپنی خوں آشام فطرت کے نتیجہ میں ظلم وفساد کا نقارہ ارض الٰہی میں بجاتے اور کشت وخون کرتے تھے، جس طرح دجال اکبر کی شخصیت ایک ہے جو قرب قیامت میں ظاہر ہوگی، مگر دجل وفریب اور دجالی کاروبار کی داستان بہت طویل ہے، اسی طرح یأجوج مأجوج ماضی کی داستان بھی تھے، اور ایک عدل پرور منصف مزاج بادشاہ نے ان کے ظلم وجور سے انسانوں کو بچانے کے لئے اپنے وقت میں اعلی ترین تحفظاتی اقدامات کئے تھے، اور ایسے ظلم وجور کی خوگر فسادی مزاج قومیں آج بھی ہیں، عربوں پر جن کے تسلط کا اشارہ حدیث میں موجود ہے، آج غور طلب ہے کہ یہ کون سی قوم ہے؟

شریف ادریسی ت/۵۵۹ء میں مغرب اقصی کا ایک مشہور جغرافیہ داں عالم گذرا ہے، وہ علم جغرافیہ کا بابائے آدم ہے، اس نے دنیا میں سب سے پہلا دنیا کا نقشہ بنایا، مجھے اس نقشہ کی خصوصیات یا ترتیب نہیں ذکر کرنا ہے، بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ اس نے اپنے نقشہ میں ''سرزمین یأجوج ومأجوج'' عین اس جگہ کو لکھا ہے جہاں آج دنیا کے نقشہ میں برطانیہ وروس قائم ہیں، اللہ

جانے کہ یہ محض بخت واتفاق تھا یا اس کی معلومات کی وسعت کہ اس نے اپنے نقشہ میں خطہ زمین کے اس جزء کو ''یأجوج مأجوج'' کی سرزمین قرار دیا ہے۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری نے ؒ اپنی شہرہ آفاق کتاب ''فیض الباری'' میں متعدد مقام پر یأجوج مأجوج پر گفتگو فرمائی ہے،'' کتاب احادیث الانبیاء'' میں یأجوج مأجوج کے تعلق سے تفصیلات ذکر کرتے ہوئے مولانا نے اس کا شارہ کیا ہے کہ یہ عہد ذوالقرنین میں صرف ماضی کا ایک قصہ نہیں تھے، بلکہ تاریخ میں متعدد مرتبہ یہ ظاہر ہوئے، اور اپنے ظلم وفساد سے ارض الٰہی کو بھر دیا، ذوالقرنین نے ان کی تمام نسل کے لئے وہ سد تعمیر نہیں کی تھی بلکہ ایک طبقہ کے لئے وہ دیوار بنائی تھی، قرب قیامت میں ان کا ظہور شدید ترین ہوگا، فرماتے ہیں:'' فلهم خروج مرة بعد مرة، وقد خرجوا قبل ذلك أيضا، وأفسدوا في الأرض بما يستعاذ منهم، نعم يكون لهم الخروج في آخر الزمان، وذلك أشدها '' یہ متعدد مرتبہ ظاہر ہوئے اور انہوں نے ایسا خطرناک فساد برپا کیا ہے کہ اللہ کی پناہ! قرب قیامت میں ان کا ظہور پھر ہوگا، اور وہ خطرناک ترین فساد کی صورت میں ہوگا، دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا کشمیریؒ نے ابن خلدون کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ اہل برطانیہ ماجوج کی اولاد ہیں، اور اس کا انہیں اقرار ہے، اور اہل روس یأجوج کی ذریت ہیں، ان کے خروج اور نکلنے کا مطلب ان کی فساد انگیزی ہے''۔

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: فیض الباری کتاب احادیث الانبیاء)

ان اشاروں کو ملحوظ رکھتے ہوئے غور کیجئے سیاہ کارناموں کی تاریخ رکھنے والے یورپین سفید فام ،فسادی مزاج، خوں آشام طبیعت کے لوگوں نے عالم عربی پر اپنے تسلط، ظلم وفساد کی کیا معرکہ آرائی برپا کی ہے، آج عالم عربی کے سیاسی فسادات کے دنگل کے پیچھے بنیادی طور پر اسی یورپین فسادی نسل کا ہاتھ ہے، امریکہ وبرطانیہ کے فسادی مزاج، خوں آشام طبیعت، ملک گیری وتسلط وجبروت کی ہوس، اپنی طاقت وچیرہ دستی کے شوق اظہار نے ان کے ہاتھوں پورے شرق اوسط کو جہنم کدہ بنا دیا ہے، اصل فسادی مأجوجی نسل تو برطانیہ ہے، مگر تاریخ بتاتی ہے کہ جب یہی سفید فام نسل موجودہ امریکہ کی سرزمین میں داخل ہوئی تو وہاں کے اصل باشندوں کو بے دریغ قتل کیا، لاکھوں انسانوں کی بدترین نسل کشی کی، ان پر غالب آ گئے، اور اپنے قہر وظلم سے ان کو مٹا دیا، امریکی سرزمین پر بھی دراصل اسی فسادی قوم کا امتداد ہے، اس نے تاریخ میں بارہا ظلم وفساد پھیلایا، انسانی آبادیوں کو اجاڑا اور بڑے خوبصورت وخوشنما عناوین سے اپنے جرائم پر پردے ڈالے، یہ ڈھکی چھپی حقیقت نہیں ہے، مگر آنکھوں میں دھول جھونک دی گئی ہے۔

ظلم وفساد کی خوگر اس قوم کی فکری یلغار اور ثقافتی حملے سے عالم عربی کب کا دونیم ہو چکا تھا، اب سیاسی حقائق کس واقف راز سے مخفی ہیں، ارض فلسطین میں اسرائیلی ریاست کس قوم کی سیاسی بازی گری سے وجود میں آئی؟ عربوں کو ترکوں کے خلاف محاذ آرائی پر کس قوم نے اکسایا، اور عرب خلافت کے خواب دکھا کر عثمانی خلافت کو کس نے سبوتاژ کیا؟ عراق کی تباہی سے لیکر مصر میں یہودیت نواز منافق حکومت کس کے ذریعہ قائم ہوئی؟ جزیرۃ العرب کی فکر وسیاست پر کون مسلط ہوا جس نے ''قرآن وسنت'' کی حکومت کو صرف قرآن چھاپنے اور کعبہ کو غلاف پہنانے کو ہی اسلام کی سب سے بڑی خدمت قرار دے دیا، باقی حقیقی اسلام کا جذبہ رکھنے والے یا تو قتل گاہوں میں ''معتدل اسلام'' کی نگرانی میں قتل کر دئے گئے، یا تعذیب خانوں میں موت سے مقابلہ آرائی کے لئے ڈال دئے گئے، اسلامی شعار اور اسلامی نام رکھنے والوں کے اندر سے کفر ونفاق سے براءت کے جذبات کو ختم اور روح محمد کو نکال کر ''صہیونی عرب'' اسلام دشمن کس نے تیار کئے ہیں؟ عالم عربی کے دولت کے ذخائر کہاں اور کیوں استعمال ہو رہے ہیں؟ کون اس سیاہ تاریخ سے واقف نہیں کہ برطانیہ نے شریف مکہ حسین بن علی کے ساتھ عرب برطانیہ معاہدہ (Arab Britian Declaration) کے ذریعہ عرب قومیت کو بیدار کر کے ترکوں کے

خلاف انہیں میدان میں اتارا تھا اور عربوں کو ان کی حکومت کے خواب دکھا کر اسی سال فرانس کے ساتھ مزید ایک خفیہ معاہدہ عربوں سے متعلق کیا تھا، جو برطانوی نمائندہ ''مارک سایکس Marc) (Sykes اور فرانسیسی نمائندہ ''جورج پیکوٹ'' (Georges Picot) کے ذریعہ ہوا تھا، اس معاہدہ کی رو سے عرب ممالک کو برطانیہ وفرانس اور روس کے درمیان تقسیم کیا گیا تھا، اور اس کے بعد شرق اوسط کی شکست وریخت، مغربی سیاسی تسلط، مختلف سیاسی، معاشی، اور صہیونی وامریکی مفادات کے پیش نظر پورے منطقہ شرق اوسط کی متعدد تقسیمات کی جا چکی ہیں، سابق سی آئی اے آفیسر ''Michael Hayden'' مائیکل ہائڈن'' کے بقول : ''شرق اوسط میں مغربی اور بالخصوص امریکی فوجی کاروائیاں، اور دہشت گرد جماعتوں کو ختم کرنے کا بہانہ دراصل مشرق وسطی کے ممالک کو چھوٹے چھوٹے ملکوں میں توڑ کر تباہ کرنا ہے، جس تقسیم کا آغاز ۱۹۸۲ء سے ہی ہو چکا تھا''۔

(www.dostor.org/1002795)

کون اس سے ناواقف ہے کہ عالم عربی کی تقسیم کے لئے (oded yinon) کے صہیونی پلان ۱۹۸۲ء سے لیکر اب تک جدید امریکی منصوبے تک کتنے نقشے اور منصوبے کبھی صہیونی وامریکی مقاصد کے لئے اور کبھی عالم اسلام پر اپنے معاشی وسیاسی تسلط کے بنائے جا چکے ہیں، اس وقت عالم اسلام کی جو بدترین افسوسناک صورتحال ہے اس کے ڈانڈے کہاں سے مل رہے رہے ہیں؟ یہ دراصل اسی فسادی، یأجوجی ومأجوجی نسل کا سیاسی، فکری، ثقافتی فساد ہے جس کے تسلط سے عالم عربی اپنے دور بطولت کو بھول کر فساد کا شکار ہی نہیں بلکہ فساد کا علمبردار بن چکا ہے، اور وہ سب کچھ ہو رہا ہے کہ آنکھوں پر یقین نہیں ہوتا، انہی فسادی اقوام کے تسلط اور ان کے ہاتھوں عربوں کی تباہی سے آگاہی کا اشارہ حدیث مذکور میں دیا گیا تھا۔

حدیث مذکور کا دوسرا جملہ بھی بہت قابل غور ہے، آنحضرت ﷺ کی زبان حق ترجمان سے اس خطرہ کے بارے میں سن کر حضرت ام المؤمنینؓ نے سوال کیا، ''أنهلك وفينا الصالحون'' کیا ہم اس حال میں بھی تباہ ہو جائیں گے کہ ہمارے درمیان ''صالحین'' موجود ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''نعم اذا كثر الخبث'' ہاں جب خباثت غالب آجائے گی، روایت کا یہ جزء انتہائی اہم اور قابل غور حقائق اپنے اندر رکھتا ہے، اس کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ اگر معاشرہ میں ''صلاح'' اور ''صالحین'' کا وجود ہے تو مہیب اجتماعی ہلاکت سے تحفظ ہو سکتا ہے، اگر ''خباثت'' غالب آجائے اور ''صلاح'' مغلوب ہو تو پھر معاشرہ کو دشمن کے ہاتھوں تباہی یا عذاب الٰہی کے تازیانے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

''صالحین'' کو ہم صوفیانہ تصور کے سانچہ میں سمجھتے ہیں، اور عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے مراد صرف ذکر ومراقبہ، صوم وصلاۃ کے پابند، تسبیح وتہجد کا اہتمام کرنے والے ہیں، حالاں کہ یہ تصور اس تعبیر کا محدود وناقص تصور ہے۔ ''صالحین'' وہ طبقہ ہے جس کو ارض الٰہی کی وراثت حوالے کی جاتی ہے، ان کا وجود قوموں کی بقاء واستحکام کا راز، اور انسانی معاشرہ کی ہلاکت وتباہی سے تحفظ کا سامان ہے، اگر یہ نہ ہوں تو دین واخلاق، امن وامان خطرے میں پڑ جائیں، بقول شیخ یوسف القرضاوی صاحب ''الصالحون تتحرر بهم البلاد ويصلح بهم العباد، وهم ملح الأرض، والأرض من غير الصالحين فساد فى فساد'' ''صالحین'' کے وجود سے ارض الٰہی کی آزادی، اور بندگان خدا کی درستگی وابستہ ہے، یہی لوگ زمین پر سالن میں نمک کے مانند ہیں، ان کے بغیر زمین فساد ہی فساد ہے'' قرآن مجید میں سورہ انبیاء میں مختلف پیغمبروں کا تذکرہ ہے، حضرت یعقوب واسحاق کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے " وَكُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِينَ " اسی طرح حضرت لوط کے بارے میں کہا گیا ہے "إِنَّهُ مِنَ الصَّالِحِينَ" حضرت نوح، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت ایوب، حضرت اسماعیل، حضرت ادریس، ذوالکفل کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے: وَأَدْخَلْنَاهُمْ فِي رَحْمَتِنَا إِنَّهُم

مِّــنَ الـصَّــالِـحِيْـن" اس سے اس وصف کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، حضرات انبیاء علیہم السلام اپنے مقام عبدیت وبندگی، تعلق مع اللہ، اخلاق وعقیدہ، اور حسن عمل، منکرات سے مقابلہ آرائی، اور باطل سے پنجہ آزمائی، اپنی استقامت وصلابت اور شجاعت وبہادری ہر پہلو سے کامل ومکمل ہوتے ہیں، وہ خود بھی صلاح وتقوی کے حامل ہوتے ہیں، اور پورے انسانی معاشرہ کو اسی رنگ وآہنگ میں ڈھالنے کی جدوجہد کرتے ہیں، وہ معاشرہ کے ہر فساد ومنکر سے پنجہ آزمائی کرتے ہیں، اور انسانی معاشرہ کو صاف وشفاف، پاکیزہ کردار بناتے ہیں، اسی جامعیت کو''صلاح'' کہتے ہیں، ''صلاح'' صرف ذاتی تقوی وعبادت تک محدود نہیں ہے، علامہ یوسف القرضاوی اپنے ایک مضمون میں اس لفظ کے بارے میں فرماتے ہیں:''صـلاح الشـيء معـنـــاه يكون ملائمـا لتـحقيق الهدف الذي يراد منه '''''صلاح'' کا مطلب ہے کسی چیز کا اپنے مقصد وجود کو پورا کرنے کے لائق ہونا'' پس اگر کوئی چیز اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے موزوں نہیں ہے تو وہ ''صالح'' نہیں، عام طور پر عربی میں دوا یا اشیاء خوردنی پر جو تاریخ وغیرہ لکھی جاتی ہے اس پر یہی لفظ لکھا ہوتا ہے''صـالـح لـغاية كذا ''فلاں وقت تک اس کا استعمال درست ہے۔قرضاوی صاحب مزید فرماتے ہیں کہ قرآن مجید نے انسان کے تین مقاصد ذکر کئے ہیں، ایک عبادت خداوندی، ارشاد باری ہے"وَمَــا خَـلَـقْـتُ الْجِنَّ وَالْــإِنــسَ إِلَّا لِيَـعْبُدُونِ" دوسرے خلافت ارضی، یعنی خدا کی زمین پر اس کے دئے ہوئے اختیارات کو صحیح استعمال کرتے ہوئے اس کے نظام وکلمہ کو نافذ کرنا، "وَإِذْ قَــالَ رَبُّكَ لِـلْـمَلاَئِكَةِ إِنِّيْ جَاعِلٌ فِيْ الْأَرْضِ خَلِيْفَةً" تیسرا مقصد ہے زمین کی تعمیر ونقش آرائی "هُـوَ أَنشَـأَكُـم مِّنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا" اسی نے تمہیں زمین سے پیدا کیا ہے اور اس میں آباد کیا ہے'' یہ دنیا میں انسانی وجود کے اعلی وبلند اور جامع ترین مقاصد ہیں، اگر انسان ان کو پورا کرنے کی اہلیت وصفات رکھتا ہے تو وہ ''صالح'' ہے، بالفاظ دیگر اگر تقوی وللّٰہیت، بندگی وطاعت، تعلق مع اللہ کے ساتھ خدا کی زمین پر اس کے قانون ونظام کو نافذ کرنے کی اہلیت وصلاحیت رکھتا ہے، نہ عبادت وطاعت میں کوتاہی کرتا ہے، اور نہ ہی حق تلفی وظلم سے کام لیتا ہے، نہ خود فساد ومنکر اختیار کرتا ہے اور نہ حکمت وبصیرت، شجاعت وفراست کے ساتھ کسی کو ظلم کرنے دیتا ہے، بلکہ اس سے مورچہ لیتا ہے، اس تصور کو''صلاح'' کہا جاتا ہے۔

اب حدیث کے الفاظ پر غور کیجئے''انهــلك وفيـنـــا الصالحون ''کیا ہم''صالحین'' کی موجودگی میں ہلاک ہوجائیں گے؟ یعنی ایسا طبقہ وگروہ جو طاعت وبندگی سے سرشار اور عبادت گذار ہو، اللہ کی زمین پر ظلم وناانصافی کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو، جن کے امانت دار ہاتھوں میں اللہ نے وراثت ارضی دینے کا فیصلہ کیا ہوا، ان کی موجودگی میں کیسے ہلاکت عام ہوگی؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:''ہاں جب خباثت کی کثرت ہوگی'' یعنی جب معاشرہ میں فواحش ومنکرات، فسق وفجور، ظلم وجور، اور گناہ ومعصیت کی کثرت ہوجائے گی، شر غالب ہوگا، خیر مغلوب ہوگی، تب اس معاشرہ کی ہلاکت یقینی ہے۔ خباثت وشر اخلاق وکردار اور اعمال میں بھی ہوتا ہے، انسانی افراد کی شکل میں بھی ہوتا ہے، جب بھی کسی زمین پر اعمال واخلاق میں خباثت وشر غالب ہوگا، یا فسق وفجور برپا کرنے والے فساق وکفار اور اس کے علمبردار موجود ہوں گے، وہاں ہلاکت وتباہی میں کیا شبہ ہے۔ حدیث کے ان اشاروں کے بعد غور کا مقام ہے کہ عالم عربی پر فسادی مزاج، یأجوجی ومأجوجی اقوام کے سیاسی، فکری، معاشی تسلط وجبروت کے بعد عالم اسلام کی سرزمین پر ان کا وجود ونفوذ موجودہ حالات سے بھی زیادہ خطرناک ترین ہلاکت کا سگنل ہے، میں اس روایت کی تشریح مشہور سعودی عالم ومفکر شیخ صالح عثیمین کے حقیقت پسندانہ الفاظ پر ختم کرتا ہوں، فرماتے ہیں:

''الـخبـث هـنــا نوعـان: الأول :الأعمـال الـخبيثة، والثاني :البشر الـخبيث، فاذا كثرت الأعمال الـخبيثة السيئة في المجتمع ولوكانوا مسلمين، فانهم عـرضـوا أنـفسهـم لـلهلاك، واذا كثر فيهم الكفار فقد

عرضوا أنفسهم للهلاك أيضا، ولهذا حذر النبی ﷺ من بقاء اليهود والنصارى والمشركين فی جزيرة العرب، حذر من ذلك فقال: أخرجوا اليهود والنصارى من جزيرة العرب، وقال فی مرض موته: أخرجوا المشركين من جزيرة العرب، وقال فی آخر حياته: لئن عشت لأخرجن اليهود والنصارى من جزيرة العرب، وقال: لأخرجن اليهود والنصارى من جزيرة العرب، حتى لا أدع فيها الا مسلما، هكذا صح عنه عليه الصلاة والسلام، ومع الأسف الشديد الآن تجد الناس كأنما يتسابقون الى جلب اليهود والنصارى والوثنيين الى بلادنا للعمالة، ويدعی بعضهم أنهم حسن من المسلين، نعوذبالله من الشيطان الرجيم، هكذا يلعب الشيطان بعقول بعض الناس حتى يفضل الكافر علی المؤمن.....فالحذر والحذر من استجلاب اليهود والنصارى والوثنيين من البوذيين وغيرهم الى هذه الجزيرة، لأنها جزيرة اسلام، منها بدأ واليها يعود، فكيف نجعل هؤلاء الخبث بين أظهرنا، وفی أولادنا، وفی أهلنا، وفی مجتمعنا، هذا مؤذن بالهلاك ولابد''۔

(شرح ریاض الصالحین ۳۳۹/۲)

''اس حدیث میں خبث سے مراد دو چیزیں ہیں، برے اعمال اور برے انسان، اگر معاشرہ میں برے وخبیث اعمال کی کثرت ہوگی، اگرچہ لوگ مسلمان ہوں، وہ ہلاکت کے نشانہ پر ہوں گے، ایسے ہی اگر خبیث انسانوں کی کثرت ہوگی تب بھی وہ معاشرہ تباہی وہلاکت کے در پہ ہوگا، یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے جزیرۃ العرب میں یہود ونصاری کی موجودگی وبقا سے ڈرایا تھا، چنانچہ ایک حدیث میں فرمایا تھا کہ یہود ونصاری کو جزیرۃ العرب سے باہر نکال دو، اپنے مرض الوفات میں فرمایا تھا: اہل شرک کو جزیرۃ العرب سے نکال دو، ایک اور موقع پر فرمایا تھا: اگر میری زندگی نے وفا کی تو میں جزیرۃ العرب سے یہود ونصاری کو نکال دوں گا، ایک اور حدیث میں فرمایا تھا؛ میں یہود ونصاری کو جزیرۃ العرب سے نکال دوں گا، یہاں تک کہ اس سرزمین پر اہل اسلام کے سوا کوئی نہ ہوگا'' یہ روایت حضور ﷺ سے ثابت ہے، مگر افسوس صد افسوس! آج تم بہت سے لوگوں کو دیکھوگے کہ وہ یہود ونصاری کو اور مشرکین وبت پرستوں کو اس جزیرہ میں آباد کرنے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں، اس پر مزید طرفہ تماشہ یہ کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ لوگ مسلمانوں سے افضل ہیں، اللہ کی پناہ شیطان مردود سے! شیطان اسی طرح بہت سے لوگوں کی عقل پر مسلط ہوجاتا ہے، کہ وہ کفار کو مسلمانوں پر ترجیح دیتے ہیں، آگاہ رہو، چوکنا ہوجاؤ، اس جزیرہ میں یہود ونصاری، مشرک وبت پرستوں کو آباد کرنے سے ڈرو، اس لئے کہ یہ سرزمین اسلام کا گہوارہ ہے، یہاں سے ہی اسلام کا آغاز ہوا، اور یہیں اسلام پھر واپس آئے گا، ان اہل خباثت کو ہم اپنے درمیان، اپنی آل اولاد کے درمیان، اپنے معاشرہ اور اپنے ملک میں کیسے ٹھنڈے پیٹ گوارا کرسکتے ہیں، ان کا وجود ہلاکت کا اعلان ہے جو لازمی طور پر آکر رہے گی''۔

ابن عثیمین کے ان الفاظ کے بعد اب مزید کسی تشریح یا اشارہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، روایت کے الفاظ پڑھئے اور عالم عربی پر یہود ونصاری، مشرکوں اور بت پرستوں کے تسلط کو دیکھئے، حالات کے تانے بانے ملایئے اور پھر یہ آیت پڑھیے: " هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُه" اگر ابھی بھی بروقت تدارک نہ کیا گیا، تو عالم اسلام کی مزید ہلاکت یقینی ہے۔

(جاری.....)

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

مشکلات اور ان کا حل

حمزہ کچن میں داخل ہوا اور تھوڑا بہت کھانا کھایا، برتن وغیرہ یوں ہی غیر مرتب اور کھلے چھوڑ کر جھٹ سے بھاگا اور جا کر ٹی وی دیکھنے بیٹھ گیا، اب جو وہ کر آیا تھا اس کو جیسے ہی ماں نے دیکھا تو فوراً اس کا دل چاہا کہ چیخنے لگے اور کہے کہ فوراً جاؤ اور سب درست کرت کے اور صاف کر کے آؤ، اس کا جی چاہنا تھا کہ وہ حمزہ سے شکوہ کرے کہ وہ تو کچن کی ترتیب وصفائی میں جان کھپاتی ہے اور تم منٹ بھر میں سب بگاڑ کر رکھ دیتے ہو، تم کو چاہیے کہ ہمیشہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے بعد سب صحیح کر کے آؤ اور باقی کھانا ٹھکانے سے رکھ کر آؤ لیکن اس نے اپنے آپ پر قابو رکھتے ہوئے نہایت اطمینان سے اس کو آواز دی اور کہا ''دیکھو بیٹا میں کچن کی صفائی اور ترتیب میں اچھا خاصا وقت صَرف کرتی ہوں لیکن جب تم اس طرح سب چھوڑ کر اور پھیلا کر جاتے ہو تو اس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے اور یہ چیز میرے لیے تھکن کا سبب بنتی ہے''، اب اس گفتگو کے نتیجہ میں حمزہ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں بچا کہ وہ معذرت کرے اور کچن کی صفائی کرے۔

یہاں ماں کو اس لیے کامیابی ملی کیونکہ اس نے مافی الضمیر کے اظہار کا وہ طریقہ استعمال کیا جس کی عام طور پر بچوں کے ساتھ گفتگو کے لیے نصیحت کی جاتی ہے، یعنی وہ طریقہ جس میں متکلم اپنے احساسات کی طرف اشارہ کرے جیسے ''یہ چیز مجھے تھکا دینے والی ہے.....''، ''یہ چیز مجھے بہت عاجز کرتی ہے.....''، یعنی جب بھی والدین کو بچوں سے کسی موضوع پر گفتگو کرنا پڑے تو وہ پوری صراحت، وضاحت اور سکون و اطمینان کے ساتھ گفتگو کریں۔

اب ایک دوسری مثال دیکھئے:

فجر کی نماز کے بعد والدین پھر سونے کے لیے لیٹ گئے، تھوڑی ہی دیر بعد پانچ سالہ سعدیہ والدین کے کمرے میں آ گئی اور اپنے والد کو جگانے لگی ان کی پشت پر کودنے لگی، جبکہ والد بہت زیادہ تھکے ہوئے تھے، اگرچہ آج چھٹی کا دن تھا مگر وہ اس قدر صبح سویرے اس کے ساتھ کھیلنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے، انھوں نے زور سے اس کو غصہ میں ڈانٹنا چاہا اور یہ کہنا چاہا کہ ''بس بہت پریشان کر لیا، اب فوراً کمرے سے چلی جاؤ، یہاں سے نکلو اور مجھے سونے دو''، لیکن انھوں نے خود پر کنٹرول کیا اور اپنے احساسات کی وضاحت کا اسلوب استعمال کیا ''دیکھو سعدیہ میں اس اس طرح .....تھکا ہوں''۔ ''مجھے نیند آ رہی ہے''، ''ابھی بہت سویرا ہے میں

تمہارے ساتھ نہیں کھیل پاؤں گا''، یہ گفتگو سن کر وہ خاموشی اور اطمینان سے کمرے سے چلی گئی، یہ الگ بات ہے کہ وہ بہت زیادہ خوش ہو کر نہیں گئی، البتہ اس بار اسے اپنے والد کے پھٹ پڑنے اور غصہ کرنے سے واسطہ نہیں پڑا بلکہ والد نے محض اپنے احساسات سے باخبر کر کے اس کی مشکل حل کر دی۔

گذشتہ فصل میں ہم نے (حسنِ استماع) یعنی مؤثر طریقے سے سننے اور بات سمجھنے کے متعلق پڑھا تھا کہ بچوں کے احساسات کو سمجھا جا سکے، اس کے برخلاف اس فصل میں ہم یہ دیکھیں گے کہ والدین کے احساسات سے بچوں کو باخبر کر کے کس طرح ان کی مدد اور اچھی تربیت کی جا سکتی ہے۔

مشکل میں کون ہے؟

جب بھی ہمارے سامنے کوئی مشکل پیش آئے تو ہمیشہ سب سے پہلے ہم کو یہ جاننے کی کوشش کرنا چاہیے کہ دراصل مشکل میں کون ہے؟ بچے؟ والد یا والدہ یا دونوں؟ حمزہ نے کچن کو غیر مرتب چھوڑا اور ممکن ہے کہ وہ خوش بھی رہا ہو لیکن اس کی ماں اس صورت حال میں کبھی خوش اور پرسکون نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ دراصل مشکل میں وہ تھی، اس لیے کہ کچن کی بے ترتیبی کا معاملہ اس سے جڑا ہوا تھا اور یہ گویا اس کے حقوق کی خلاف ورزی ہوئی تھی، ہاں اگر معاملہ یہ ہوتا کہ حمزہ اپنے کسی کھلونے کے ٹوٹ جانے سے پریشان ہوتا تو ماں کے لیے زیادہ آسان تھا کہ وہ اس کی مدد کرتی، مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں تو مشکل میں دراصل ماں ہے، یہ فرق کرنا بہت ضروری ہے کہ مشکل میں کون ہے، کیونکہ والدین کو اس کا اندازہ کر کے دو مختلف نوعیّتوں سے عمل کرنا پڑے گا، آئندہ سطروں میں ہم دیکھیں گے کہ بہر دو صورت یعنی بچہ مشکل میں ہو یا والدین، مگر والدین بچے کی کس طرح اپنے برتاؤ سے مدد کرتے ہیں یا ان کو کرنا پڑتا ہے۔

جب بچہ مشکل میں ہو:

عام طور پر والدین بچوں کی مشکلات کس طرح حل کرتے ہیں؟ اس سوال کا جواب تلاش کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ عام طور پر والدین بچوں پر تنقید کرتے ہیں، یا ان کو لکچر پلاتے ہیں، نصیحتیں کرتے ہیں، ان کی غلطیوں کو واضح کرتے ہیں، کچھ لوگوں کا رویّہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بچے کو لے کر ایک طرف ہٹ جاتے ہیں اور اس کو نصیحت کرتے ہیں جبکہ اکثر و بیشتر محض نصیحتیں مفید نہیں ہوتیں، اولاً تو ایسے موقع پر نصیحت نصیحت ہی نہیں رہتی، دوسرے بچہ اس کو ماننے اور سمجھنے سے انکار کر دیتا ہے، تیسری بات یہ کہ یہ معاملہ بہت اہم اور حساس ہے، یہ اسلوب سرے سے ذمہ دار والدین کے اس اسلوب کے مخالف ہے جس کے متعلق گذشتہ فصل میں ہم نے گفتگو کی، ہاں ایسا ہوتا ہے کہ کبھی کبھی والدین کو نصیحت کرنا پڑے اور کرنا بھی چاہیے، مگر بہتر یہ ہے کہ بچے کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کیا جائے کہ وہ خود ہی ان مشکلات کا حل تلاش لے۔

جب بچہ مشکل میں ہو تو درج ذیل چار امور اس مقصد کے حصول میں بہت معاون ہوں گے:

۱- سب سے پہلے تو مؤثر انداز میں بچے کی بات سنیے، کیونکہ اس طرح بہتر انداز میں اس کی پریشانی کی نوعیت و کیفیت کو سمجھنے میں مدد ملے گی، ''ایسا لگتا ہے کہ تم اپنے امتحان کو لے کر بہت پریشان ہو.....''۔

۲- بچے کے ساتھ مل کر مشکل کے مشترک حل تک پہنچنے کی کوشش کیجئے، ''تم کو کیا لگتا ہے اب اس وقت تم کو کیا کرنا چاہیے؟''، ''کون سے امور ہیں جن کو تم سب سے پہلے تبدیل کرنا چاہتے ہو''؟ پھر والدین کے لیے یہاں یہ بھی ممکن ہوگا کہ وہ اپنا نظریہ بھی پیش کریں اور ساتھ ہی دوسرے احتمالات کا بھی ذکر کریں، ان احتمالات کو لکھ لینا بھی مفید ہے تاکہ وہ ان سب کو پڑھے۔

۳- پھر کسی ایک فکر واحتمال کو اختیار کرنے میں اس کی مدد کیجئے، اس طرح کہ بچے کے ساتھ مل کر ہر احتمال کے مثبت ومنفی پہلو اور نتائج پر غور کیجئے حتی کہ یہ واضح ہو جائے کہ ان میں سے کسی ایک (فلاں احتمال) کا اختیار کرنا بہتر ہوگا، ''ان میں سے کس احتمال کو تم مناسب سمجھتے ہو''؟ پھر اس رائے کے نفاذ کی کوشش کیجئے۔ ''اس حل کی ابتدا تم کب سے کر سکتے ہو''؟ ''اس کے نفاذ میں تم کو کتنا وقت لگ سکتا ہے''؟ اس موقع پر ان امور کو لکھ لینا بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

۴- اس کے ساتھ نفاذ کے عمل کی مراجعت کے لیے وقت کی تحدید کیجئے، اس طرح کہ ''ہم دوبارہ یہ دیکھنے کے لیے کب بیٹھیں کہ معاملات کیسے چل رہے ہیں''؟

اگر مشکل میں والدین ہوں:

جب بچوں سے والدین کو کوئی پریشانی ہوتی ہے تو عام طور سے وہ اس کی تصحیح کرتے ہوئے ''تو اور تم'' کا استعمال کرتے ہیں مثلاً ''تم نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا.....''، ''تم گھر میں داخل ہوتے وقت اپنے جوتے باہر صاف کر کے نہیں آتے.....''، ''تم نے بہت پانی بہا دیا.....'' وغیرہ۔ اگرچہ اس موقع پر والدین دوسری چیزوں کا ذکر نہ بھی کریں پھر بھی بچہ عتاب محسوس کرتا ہے، الفاظ اور آواز کی سختی کا دباؤ محسوس کرتا ہے، یہ اسلوب غیر مناسب بھی ہے اور غیر مؤثر بھی، بہتر یہ ہے کہ جب بچے پریشانی کا سبب بنیں تو والدین بغیر مذمت والزام کے ان کا سامنا کریں، یعنی نہ ان کی مذمت کریں اور نہ ان کو الزام (Blame) دیں، بلکہ بہت دانشمندی کے ساتھ اپنے مطلوب کو اس طرح حاصل کریں کہ ان کا برتاؤ مؤثر ہو، تاکہ اس کے اثرات بچے کے سلوک واخلاق پر بھی اچھے مرتب ہوں۔

مثلاً آپ کہیں کہ ''میں ایسا محسوس کرتا ہوں.....'' بجائے اس کے کہ ''تم نے ایسا کیا.....'' تو اس میں زیادہ فائدہ ہے، مثلاً جب کوئی باپ یہ کہتا ہے ''میں محسوس کرتا ہوں کہ میں .....'' تو اس میں انسانیت کا پہلو ہونے کے ساتھ بچے کی محبت اور اس کے احترام کا بھی اس جملہ سے اظہار ہوتا ہے، اس کے برخلاف اگر ملامت، ڈانٹ ڈپٹ اور چیخنے چلانے کا طریقہ استعمال کیا جائے تو یہ طریقہ بچے کے لیے تکلیف دہ ہوگا اور وہ نتیجہ بھی نہیں حاصل ہوگا جو بغیر الزام دیے اور مذمت کیے بچے کے برتاؤ سے ظاہر ہونے کی امید ہے۔

اس کی مثال دیکھئے مثلاً یوں کہیں ''جب تم کمرے میں اپنا سامان پھیلا ہوا چھوڑ دیتے ہو تو اس وقت مجھے بہت پریشانی ہوتی ہے اور شرمندگی محسوس ہوتی ہے بالخصوص تب جبکہ اسی حال میں مجھے کرنا پڑتا ہے، کسی مہمان کا استقبال کرتی ہوں'' یا ''جب تم اپنے بھائیوں کے ساتھ مل جل کر نہیں کھیلتے تو میں دیر تک تکلیف میں رہتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ کس طرح تم کو سمجھاؤں اور سب کو اس مشکل سے باہر نکالوں''۔

یقیناً ذاتی احساسات کی وضاحت کا یہ اسلوب ''میں ایسا ایسا.....'' ساری مشکلات کا حل نہیں ہے لیکن کچھ نہ کچھ ضرور حل کر دیتا ہے اور بقیہ کے حل کی راہ بھی ہموار کر دیتا ہے۔

البتہ غصہ ہونے اور پھٹ پڑنے اور مختلف طرح کے ردعمل کے بالمقابل اس طرح کے چھوٹے چھوٹے جملوں کا استعمال ''میں بہت تھکن محسوس کر رہا ہوں، آج میں بہت پریشان ہوں'' ہمیشہ مفید و بہتر ہوتا ہے، بچوں کو ملامت کرنے ان کو گناہ کا احساس دلانے اور یہ باور کرانے کہ وہی تنہا مشکلات کا سبب ہیں کے بالمقابل یہ ہمیشہ افضل اور نفع بخش رہتا ہے۔

گذشتہ مثالوں میں آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ بچے کے سلوک پر توجہ نہیں دی گئی بلکہ اس کے برتاؤ کے نتائج کا ذکر کیا گیا، والدین کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے احساسات کے اظہار کے ساتھ بچے کے سلوک کو بھی مربوط کر دیں، مگر یہ

ملحوظ رہے کہ توجہ پھر بھی نتیجہ پر مرکوز رہے سبب و برتاؤ پر نہیں مثلاً ''میں اس وقت بہت سوچ میں پڑ جاتا ہوں اور پریشان ہوتا ہوں جب کہ تم رات میں تاخیر سے آتے ہو''۔

بعض والدین بچوں کے ساتھ اس اندازِ خطاب کو مؤثر نہیں سمجھتے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بات شروع تو ''میں'' سے کرتے ہیں مگر پھر پوری توجہ ''تم'' پر مرکوز کر دیتے ہیں، مثلاً ''مجھے بہت غصہ آتا ہے جب تم بدسلوکی کرتے ہو اور مسلسل اپنے چھوٹے بھائیوں پر زیادتی کرتے ہو''، اس لیے ضروری ہے کہ والدین اپنے احساس کی ترجمانی میں نہ سخت آواز ولہجہ استعمال کریں اور نہ ہی بچہ کو ملامت ومعتوب کریں، بس نرمی سے اپنے احساسات کی ترجمانی کر دیں۔

والدین کو اس کی نصیحت نہیں کی جاتی کہ وہ بہت کثرت سے بچوں کے ساتھ گفتگو میں اس طریقہ کا استعمال کریں، مگر سلبی احساسات مثلاً ''غصہ'' وغیرہ کا بھی زیادہ ذکر نہ کریں، بلکہ اس کے بجائے چھوٹے چھوٹے جملوں کا استعمال کریں اور محدود لفظیات واحساسات مثلاً ''متاثر ہونا، شرمندہ ہونا، تکلیف ہونا، بے چینی محسوس کرنا'' وغیرہ کا استعمال کریں۔

یہ مفید ہے کہ کہ آپ بچوں کے سامنے اپنے مثبت احساسات رکھیں، ''آج تم نے باغیچہ میں کام کیا، اس سے میں بہت خوش ہوا جب پارک مرتب ہو تو آدمی کس قدر لطف اندوز ہوتا ہے''۔

معذرت خواہانہ جملے جن کی شروعات ''میں'' سے ہو ہمیشہ بہت مؤثر وطاقتور ہوتے ہیں، مثلاً ''مجھے افسوس ہے کیا تم مجھے معاف کرو گے، مہلت دو گے''، ''میں معذرت خواہ ہوں'' وغیرہ اپنے آپ میں موثر جملے ہیں، ہمیشہ غلطی پر معذرت اپنے ہی حق میں ہوتی ہے خواہ سامنے والا بچہ کیوں نہ ہو، سچ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینك و بینه عداوة كأنه ولی حمیم۔ (فصلت ۳۴) ''برائی کو اس طریقے سے دور کرو جو سب سے اچھا ہو، جس کے نتیجہ میں تمہارے اور جس شخص کے درمیان عداوت تھی وہ تمہارا جگری دوست اور گرم جوش ساتھی بن جائے گا''۔

خلاصہ:

اس فصل میں ہم نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ جب اولاد و والدین کے درمیان کوئی مشکل پیدا ہو جائے تو اس وقت کس طرح کا برتاؤ کیا جائے، مثلاً بچہ بے ادبی و بے احترامی کا ارتکاب کرتا ہے، وقت پر سونے نہیں جاتا، بہت زیادہ ٹی وی (اب ٹی وی کی جگہ موبائل نے لے لی ہے) دیکھنے کا عادی ہے، اس کے دوست اچھے نہیں ہیں، ایسے موقع پر دو طریقے ہو سکتے ہیں لیکن اس سے پہلے یہ پتہ لگانا ضروری ہے کہ مشکل میں ہے کون؟ اس لیے سب سے پہلے اپنے آپ سے سوال کیجئے کہ ''اس مشکل سے پریشانی کس کو ہے مجھے یا میرے بچے کو''؟

اگر آپ اس مشکل سے دوچار اور پریشان ہیں، تو یہ آپ کی مشکل ہوئی، اب آپ اپنے آپ سے سوال کیجئے، ''اس رویے یا مشکل کا مجھ پر کیا اثر ہے اور میں اس کی وجہ سے کیا محسوس کر رہا ہوں؟ پھر ''میں'' کا استعمال کرتے ہوئے اپنے بچے کے سامنے احساسات بیان کر دیجئے۔

اگر پریشانی بچے کو ہو، وہ شاکی ہو تو پھر آپ کو مؤثر انداز میں (حسن استماع) اس کی بات سننا پڑے گا، اگر مسئلہ زیادہ بڑا اور پیچیدہ ہے، تو یہ بھی مفید ہوگا کہ آپ تھوڑی دیر کے لیے اس جگہ سے ہٹ جائیں اور کسی دوسرے وقت اس مشکل کے متعلق اس سے بات کریں، یہاں گذشتہ صفحات میں مشکلات کے حل کے لیے جو چار مراحل ذکر کیے گئے ان کا استعمال کرنا بہتر ہوگا۔

اکثر اوقات مشکلات اور پریشانیوں کے حل کے

لیے صرف ''گفتگو'' ہی کافی نہیں ہوتی۔ آئندہ فصل میں ہم بیان کریں گے کہ وہ کون سے کام ہیں جو ایسے موقع پر کیے جا سکتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مسائل کے حل میں وضاحت و گفتگو کا استعمال ہمیشہ مفید ہوتا ہے۔

پتہ کیجئے کہ ان حالات میں پریشان کون ہے، مشکل میں کون ہے۔

- آپ کا بچہ ایسا ضدی ہے کہ جب بھی کپڑے پہنتا ہے یا دسترخوان پر بیٹھتا ہے تو ہمہ وقت ہنگامہ برپا رکھتا ہے، اس سے جب بھی کسی کام کا مطالبہ کیا جائے تو انکار کر دیتا ہے۔
- آپ کا بچہ ابھی دو سال کا ہے اور اس نے زینے پر چڑھنا شروع کر دیا ہے۔
- آپ کا بچہ روتا ہے، اور جب آپ اپنی پڑوسنوں کے ساتھ ہوتی ہیں، اس وقت وہ آپ کا احترام نہیں کرتا۔
- بچے آپس میں ضرورت سے زیادہ جھگڑا کرتے ہیں۔
- آپ کا بچہ پڑوسی کے بچے پر زیادتی کرتا ہے۔
- اسکول کا کام کبھی مکمل نہیں ہوتا یا سرے سے لکھتا ہی نہیں ہے۔
- سونے کے وقت سے بچہ تجاہل برتتا ہے۔
- نوجوان بچہ ہمیشہ اپنے دوستوں میں لگا رہتا ہے، کبھی اپنے اسکول کا کام نہیں کرتا۔

گھریلو مشق:

۱- کوشش کیجئے کہ ہر ہفتہ اپنے احساسات کو بیان کرنے والی ایک تعبیر بچے کو دیجئے جس کی ابتدا ''میں'' سے ہو، پھر دیکھئے کہ اس مشق کے ذریعہ اور اس کے استعمال سے اس کے اندر کیسی بہتری آئے گی۔

۲- کوئی وقت متعین کیجئے، جس میں آپ ہفتہ میں ایک بار بیٹھ کر اپنے بچے کے ساتھ مشکل کے حل کے لیے ذکر کردہ چاروں مراحل کی روشنی میں مذاکرہ کریں۔

ان نقاط کو پہلے سے ہی لکھ لیجئے:

- بچوں میں سے کس کے ساتھ بیٹھنا ہے؟
- تطبیق کے لیے مناسب مشکل کون سی ہوگی؟
- اس کام کو انجام دینے کا وقت کیا ہوگا؟

مثالیں اور عملی موقف:

درج ذیل مثالوں میں آپ یہ جاننے کی کوشش کریں کہ پریشانی کس سے متعلق ہے؟ اگر والدین کو پریشانی ہو رہی ہے تو اپنے احساسات کے اظہار والی تعبیر اختیار کیجئے۔

☆ ایک ایسی پڑوسن جس سے آپ کی کم ہی ملاقات ہوتی ہے، جیسے ہی آپ اس سے بات چیت شروع کرتی ہیں آپ کی ۶ رسالہ بچی بات کاٹنا شروع کر دیتی ہے۔

☆ عثمان سائیکل سے اپنے چچا کے گھر جاتا ہے، چند منٹ بعد ہی وہ یہ کہتے ہوئے واپس آتا ہے ''ابا دیکھئے کیا ہوا میرے ساتھ، سائیکل کا اگلا ٹائر پھٹ گیا، اب میں کیا کروں''؟

☆ ماں کچن میں کھانا تیار کرنے کے لیے جاتی ہے، اسی اثنا میں عصام کچن میں داخل ہوتا ہے اور چاروں طرف اپنے کھلونے پھیلا دیتا ہے۔

☆ آپ کی دس سالہ بیٹی داخل ہوتی ہے، جو مضمحل اور پریشان نظر آتی ہے، وہ کہتی ہے کہ ایک اہم امتحان میں وہ غلط کرنے سے ناکام ہوگئی ہے۔

یہاں اب ہم ایک مثال ذکر کرتے ہیں جس میں آپ ماں بیٹے کی گفتگو ملاحظہ کریں اور دیکھیں کہ مشکلات کو حل کرنے والے چاروں مراحل کو کس طرح استعمال کیا گیا ہے۔

سلیم: (زور سے دروازہ بند کرتے ہوئے) گھر میں بہت

ضروری کام ہوتے ہیں، ہر ایک یہی کہتا رہتا ہے اپنا کمرہ مرتب کرو، میز صاف کرو، زمین پر پونچھا لگاؤ، پلیٹیں دھوؤ، مجھے اس زندگی سے نفرت ہے۔

ماں: ایسا لگتا ہے کہ کام بہت ہے جس سے تم پریشان ہو اور اکتا گئے ہو۔

سلیم: جی میں واقعی عاجز ہوں، میرے علاوہ دوسرے لڑکوں کو گھر میں کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔

ماں: اچھا: اسی وجہ سے تم کو یہ احساس ہوتا ہے کہ تم گویا مظلوم ہو اور یہاں تمہارے اوپر بہت بوجھ ہے۔

سلیم: جی! صحیح ہے اور سب سے بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ حکم کا سلسلہ کبھی ختم ہی نہیں ہوتا۔

ماں: تمہارا کیا خیال ہے، تم کیا سوچتے ہو، اس سلسلے میں تمہارے لیے کیا کرنا ممکن ہے؟

سلیم: میں کچھ نہیں کرسکتا، اس گھر میں مجھ کو فیصلے کرنے کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔

ماں: چلو فرض کرو کہ تم کو فیصلہ کا حق ہے، اب بتاؤ کیا فیصلہ ہے تمہارا، مگر جو بھی فیصلہ کرو وہ انصاف پر مبنی ہونا چاہیے۔

سلیم: بہتر ہے، میرا یہ کہنا ہے کہ آپ لوگ بڑے ہیں اور بہت اچھے ہیں، آپ ہی لوگوں کو سب کام کرنا چاہیے۔

ماں: یہ تو ایک احتمال ہوا اور کچھ بتاؤ جس میں عدل بھی ملحوظ ہو؟

سلیم: کوئی باتنخواہ ملازم رکھ لیجئے جو آکر یہ سب کام کرے۔

ماں: یہ دوسرا احتمال ہوا اور کوئی رائے۔

سلیم: کم سے کم اتنا تو ہونا چاہیے کہ آپ لوگ کام انجام دینے میں شرکت کریں، ایک انسان بہت سارے کام نہیں انجام دے سکتا۔

ماں: بہت بہتر! ہمارے سامنے تین احتمالات (Option) ہیں، ایک یہ کہ میں اور تمہارے ابا یہ سارے کام کرنے میں شریک ہوں، دوسرے یہ کہ ہم کوئی ملازم رکھیں، تیسرے یہ کہ ہم سب مل کر یہ ساری ذمہ داریاں پوری کریں، تمہارے خیال میں سب سے بہتر حل کیا ہوسکتا ہے؟

سلیم: (پہلے سے زیادہ نرم لہجہ میں گفتگو کرتے ہوئے) پہلے اور دوسرے احتمال میں آسان حل ہے مگر اس میں آپ پر اور والد پر ظلم ہوگا۔ (پھر ذرا خاموش رہ کر) امی آپ کا کیا خیال ہے کیا ہم لوگ ایک ملازم رکھ سکتے ہیں؟

ماں: ہمارے لیے اس کی تنخواہ ادا کرنا محال ہوگا، اب کیا آپشن بچا ہمارے سامنے؟

سلیم: پھر تو ہمیں اشتراکِ عمل کے ذریعہ مسئلہ حل کرلینا چاہیے۔

ماں: تو پھر تم اپنے حصہ کا کام کرنے کے لیے تیار ہو۔

سلیم: ایک شرط کے ساتھ کہ اس کام میں میرا زیادہ وقت نہ لگے، بتایئے میرے ذمہ کیا کام ہوگا؟

ماں: تم ہی بتاؤ تمہارے لیے کون سا کام بہتر رہے گا۔

سلیم: (سوچتے ہوئے) میں دسترخوان لگانے اور پھر اسے صاف کرنے کی ذمہ داری لیتا ہوں۔

ماں: بہت اچھا! لیکن دیکھو میں تم کو بار بار یاد نہیں دلاؤں گی، سوچ لو کہ جس کام کی ذمہ داری تم لے رہے ہو اسے تم کو یاد رکھنا ہوگا اور انجام دینا ہوگا۔

سلیم: آپ کیا سمجھتی ہیں اگر مجھے یہ کام نہ کرنا ہوتا تو میں اس کی ذمہ داری کیوں قبول کرتا۔

ماں: بہت اچھا، چلو ہم ایک ہفتہ اسی حل پر عمل کر کے دیکھتے ہیں، پھر دیکھیں گے کہ سب امور کیسے انجام پا رہے ہیں، اب تم اس حل اور معاہدہ سے مطمئن ہو نہ؟

سلیم: جی بہتر ہے! ہم تجربہ کرتے ہیں، ایک ہفتہ بعد پھر دیکھیں گے۔

☆☆☆

❑ گوشۂ تاریخ

عہد اکبری مکتوبات امام ربانی کے آئینے میں

محمد خبیب
ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی

عہد اکبری ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا وہ سیاہ دور ہے جس کی نظیر نہ سابق میں ملتی ہے اور نہ بعد کے قرون میں، اس دور میں اسلام، بادشاہ وقت کی اسلام کش پالیسیوں اور ہنود کی چیرہ دستیوں سے کس مپرسی اور غربت میں اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا، اسلام کے محافظ اور پاسباں کہلانے والے علماء چند ٹکوں کے عوض اپنے ایمان کا سودا کر رہے تھے، ایمان کے نور سے قلوب کو منور کرنے والے صوفیا بدعت وضلالت کو سر عام فروخت کر رہے تھے اور اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والی قوم تہذیب غیر کے عشق میں سرمست ہوکر اپنے تشخص کو خیر آباد کہنے والے تھی۔ ایسی ناگفتہ بہ صورتحال میں شیخ احمد سرہندی، معروف بہ مجدد الف ثانیؒ نے دین کی حفاظت اور تجدید کا لازوال کارنامہ انجام دیا، آپ نے عالم مشرق کو بیدار کرنے، انسانیت کو فروغ دینے، اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور احیاء دین وملت کے لئے اس دور کے سب سے طاقتور ذرائع ابلاغ یعنی خطوط کو تبلیغ واشاعت اسلام، تحفظ سنت وامانت بدعت کا وسیلہ بنایا اور صفحۂ قرطاس پر اپنے درد وکرب کو خون جگر سے رقم کرکے ملک کے امراء، زعماء، رؤساء، صاحبان منصب واقتدار، ارباب بصیرت، اہل علم وفضل اور دردمندان ملک وملت کی توجہ منعطف کرانے کا جرأت مندانہ قدم اٹھایا جس سے خاطر خواہ نتیجہ ظہور پذیر ہوا، پژمردہ قلوب کو حیات نو ملی، ایمان کی باد بہار چلی اور فکروں میں صالح انقلاب پیدا ہوا۔

امام ربانی مجدد الف ثانی کے یہ مکتوبات تین دفاتر پر مشتمل ہیں جن میں کل ۵۳۶ مکتوبات ہیں، دفتر اول کا تاریخی نام در المعرفت ہے اس میں ۳۱۳ مکتوبات ہیں اس کے مرتب خواجہ یار محمد جدید بدخشی الطالقانیؒ ہیں، اس دفتر کی تکمیل ۱۰۲۵ھ/ ۱۶۱۶ء میں ہوئی، دفتر دوم کا اسم تاریخی نور الخلائق ہے اس میں کل ۹۹ مکتوبات ہیں اس کو خواجہ عبد الحی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۰۲۸ھ/ ۱۶۱۹ء میں مرتب کیا، دفتر سوم کا عنوان معرفۃ الحقائق ہے اس میں کل ۱۲۴ مکتوبات ہیں اس کو خواجہ محمد ہاشمؒ نے ۱۰۳۱ھ/ ۱۶۲۲ء میں جمع کیا۔ ان مکتوبات کی اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے بنظر غائر مطالعہ سے ہمیں اکبری دور کی صحیح صورت حال کی اطلاعات بھی فراہم ہوتی ہیں، ان مکتوبات میں اس دور کی تاریخ دربار سے لیکر خانقاہوں تک، منبر ومحراب سے لیکر مسند درس وتدریس تک، گلی کوچوں سے لیکر بازاروں تک اسلام کی کس مپرسی کی لرزہ خیز داستان کی شکل میں ملتی ہے۔ اس اعتبار سے مکتوبات امام ربانی اکبری دور کی ایک اہم تاریخی مستند دستاویز کی حیثیت بھی رکھتے ہیں، اس بات سے کسی بھی صاحب علم کو انکار نہیں ہوسکتا

کہ ملا عبدالقادر بدایونیؒ کی ''منتخب التواریخ'' عہد اکبری میں دربار اور بیرون دربار اسلام کی صورتحال جس تفصیل سے بیان کرتی ہے کسی اور کتاب میں اتنی تفصیل کے ساتھ موجود نہیں ہے۔ اکبر کے دین الٰہی کا تذکرہ اور اس کے ہمہ گیر مضار ومفاسد کا ذکر جس شرح وبسط اور جرأت ودلیری کے ساتھ ملا عبدالقادر بدایونی نے کیا ہے تاریخ اس پر ہمیشہ ان کی احسان مند رہے گی۔ بعد کے دور میں اکبری دور کی دینی صورتحال کا نقشہ جن حضرات نے کھینچا ہے انھوں نے کم وبیش ''منتخب التواریخ'' سے ہی استفادہ کیا ہے اور یہی کتاب سب کے لئے مرجع رہی ہے لیکن اس بات سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ مکتوبات امام ربانی میں بھی اس دور کی تاریخ اجمال کے ساتھ مگر بڑے مؤثر، دل نشین اور دلآویز انداز میں موجود ہے جس سے یقیناً ایک صاحب بصیرت شخص دور اکبری کا ایک اجمالی نقش اپنے ذہن پر ضرور مرتسم کرسکتا ہے، اور اس دور کی دینی، سماجی اور معاشرتی صورتحال کا اندازہ کرسکتا ہے، چنانچہ سطور ذیل میں مکتوبات امام ربانی کی روشنی میں عہد اکبری کا جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

ہندوستان جہاں قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں بلند ہوتی تھیں دور اکبری میں وہ کفرستان بن چکا تھا، اس کے ہر کوچۂ وبازار میں کفر کے ناقوس بج رہے تھے، کفر اور کفار کی مدح سرائی کے نغمے گائے جارہے تھے اور اسلام غربت اور یتیمی کی زندگی گذار رہا تھا، اس کا ضعف واضمحلال اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا، برملا اسلام کا تمسخر اڑایا جارہا تھا، اس پر عمل سے بانگ دہل روکا جارہا تھا اور جو اس دین یتیم کو گلے سے لگانے کی کوشش کرتا اس پر طعن وتشنیع کے تیر ونشتر برسا کر اس کے وجود مسعود کو ذلت کے نقاب میں ڈھانکنے کی کوشش کی جارہی تھی، ایسے افراد جو شریعت محمدیہ ﷺ پر عمل پیرا ہونے اور اس کے احیا کی برملا کوشش کررہے تھے ان کو ہر محاذ پر ناکام بنانے اور ان کی شخصیت کو مکروہ بنانے کی سیاسی اور سماجی اداروں کی جانب سے منظّم کوشش کی جارہی تھی تاکہ معاشرہ میں ترویج واشاعت اسلام سے وابستہ افراد اس سزا کو درس عبرت کے طور پر لیتے ہوئے احکام اسلام کے اجراء سے اپنے آپ کو پیچھے ہٹالیں۔

حضرت مجددؒ نے خان اعظم کو تحریر کردہ ایک خط میں اس صورتحال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

غربت اسلام تا بحدی رسیدہ است کہ کفار برملا طعن اسلام وذم مسلمانان می نمایند وبے تحاشا اجراء احکام کفر ومداحی اہل آن در کوچۂ وبازار می کنند ومسلمانان از اجرائے احکام اسلام ممنوع اند ودراتیان شرائع مذموم ومطعون

بیت:

پری نہفتہ رخ ودیو در کرشمہ وناز بسوخت عقل زحیرت کہ این چہ بوالعجبی ست۔(۱)

اسلام کی غربت کا یہ عالم ہے کہ کفار برملا اسلام پر طعن اور مسلمانوں کی مذمت بیان کرتے ہیں اور بے محابا کوچہ وبازار میں مراسم کفر ادا کرتے اور اہل کفر کی تعریفیں کرتے اور اس کے برعکس مسلمانوں کے لئے اسلام کے احکام پر عمل کرنا ممنوع ہوگیا ہے اور جو شریعت پر عمل کرتا ہے وہ مذموم ومطعون ہوجاتا ہے، **شعر**

پری منہ چھپائے ہوئے ہے اور دیو کرشمہ وناز کا مظاہرہ کررہا ہے عقل حیرت کی وجہ سے سوختہ ہوگئی ہے کہ کیا معاملہ ہے۔

اسی طرح لالہ بیگ کو تحریر کردہ ایک خط میں حضرت

مجدد اسلام کی اس زبوں حالی بلکہ شکستہ حالی کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

غربت اسلام نزدیک بیک قرن است بر نہجی قرار یافتہ است کہ اہل کفر بمجرد اجرای احکام کفر برملا در بلاد اسلام راضی نمی شوند میخواہند کہ احکام اسلامیہ بالکلیہ زائل گردند واثری از مسلمانان ومسلمانی پیدا نشود وکار را تا بآن سرحد رسانیدہ اند کہ اگر مسلمانی از شعار اسلام اظہار نماید بقتل میرسد۔(۲)

کہ اسلام کی غربت پر ایک صدی گذر چکی ہے اور نوبت بایں جارسید کہ کفار اب اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ اپنے مذہب کفر پر برملا اور کھلم کھلا عمل کریں بلکہ اب تو ان کے دلوں کی یہ تمنا ہے کہ احکام اسلام مکمل طور پر فنا ہوجائیں اور اسلام اور مسلمانوں کا کوئی نام ونشان باقی نہ رہے اور ان کی ہمتوں میں عروج یہاں تک آ گیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان شعائر اسلام کا اظہار کرتا ہے تو اس کو قتل کردیا جاتا ہے۔

دور اکبری میں پورے ملک میں مسلمانوں پر ظلم وستم کا ایک لامتناہی سلسلہ روا رکھا جارہا تھا، مسلمانوں کا لہو مانند آب ارزاں ہوگیا تھا، کوچہ کوچہ سے ان کی عزت کا جنازہ نکالا جارہا تھا، ان کی املاک کو نذر آتش اور ان کے شہروں کو ویران کیا جارہا تھا، بلکہ ان کا پورا سفینہ ہی استبداد کی طوفاں خیز موجوں میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ حضرت مجددؒ نے خواجہ شرف الدین حسینؒ کو تحریر کردہ ایک خط میں نگرکوٹ کے گرد ونواح میں مسلمانوں پر ہونے والے اسی طرح کے ظلم کا ان درد بھرے الفاظ میں اس طرح تذکرہ کیا ہے:

معلوم شما شدہ باشد کہ درین روزہا کفار دارالحرب نواحی نگرکوٹ بر مسلمانان وبلاد اسلام چہ ستمہا نمودند چہ اہانتہا رسانیدند خذلھم اللّٰہ سبحانہ این قسم گلہائے بدبو بمقتضائے آخر الزمان بسیار خواہد گشت۔(۳)

آپ کو معلوم ہوچکا ہوگا کہ انہیں دنوں میں دار الحرب کے کافروں نے نگرکوٹ کے گرد ونواح میں مسلمانوں پر اور ان کے شہروں پر کیا کیا ظلم کئے اور ان کی کتنی اہانت کی ہے، اللہ سبحانہ وتعالی ان کو ذلیل کرے۔ آخری زمانہ کے تقاضے کے مطابق اس طرح کے بدبودار کتنے ہی پھول کھلیں گے۔

یہ تمام شہادتیں اور گواہیاں دور اکبری کے کسی مؤرخ کی زبانی نہیں ہے بلکہ خانقاہ مجددیہ میں بیٹھے ہوئے اس مرد آشنا کی ہیں جس کی عقابیں نگاہیں خطۂ ہند کے ایک ایک چپہ پر تھیں، وہ مرد باہوش اس بات کا صاف ادراک کررہا تھا کہ اس ملک میں مسلمانوں کی نسل کشی یا ان کو برہمنی رنگ میں رنگ دینے اور اسلام کا بالکلیہ نام ونشان مٹادینے کا خونی فیصلہ کرلیا گیا ہے۔ بس انتظار تھا ایک مناسب وقت کا جس میں یا تو تمام مسلمانوں کو کفر کا جام پلادیا جاتا یا پھر ان کے لہو سے اس سرزمین ہند کو لالہ زار کردیا جاتا۔ شیخ فرید کو تحریر کردہ ایک خط میں اس خطرناک منصوبہ بند سازش کا تذکرہ ان درد بھرے الفاظ میں اس طرح کرتے ہیں:

ومنتظر ند اگر قابو بیابند دمار ا از اہل اسلام برآرند یا ہمہ را بقتل برسانند یا بکفر باز گردانند۔(۴)

کہ وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ اگر ان کو موقع مل جائے تو مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل لیں یا سب کو موت کے گھاٹ اتار دیں یا پھر کفر میں لوٹا دیں۔

اس خونی فیصلہ کی ننگی تلوار مسلمانوں کے سر پر لٹکی ہوا دیکھ کر مجدد وقت چیخ اٹھا ''الغیاث ثم الغیاث ثم الغیاث''

اس کی اسی فریادرسی کی فغان مسلسل اور صدائے بازگشت نے قلوب میں منجمد برف ایمانی کو پگھلا دیا اور ایسے ایمان کے چشمے بہے کہ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورا برصغیر اس چشمۂ ایمانی سے بہرہ ور ہوا۔

اس نیستاں میں مسلمانوں کے خلاف جو آگ لگی تھی اس کی شعلہ فشانیاں اس حد تک پہنچ چکی تھیں کہ اس وقت پورے ہندوستان میں بے تحاشا کثرت کے ساتھ مسلمانوں کے عبادت خانوں کو پاش پاش کر کے صنم کدوں کی تعمیر کی جارہی تھی، ہنود کی ان پر تشدد کاروائیوں پر نہ کسی کو قانونی چارہ جوئی کا حق تھا اور نہ ہی لب کشائی کا۔ حضرت مجددؒ میر نعمان بدخشی کو تحریر کردہ ایک خط میں انہدام مساجد کی دلخراش صورتحال کو اس طرح قلم بند کرتے ہیں:

کفار ہند بے تحاشای ہدم مساجد می نمایند ودر آنجا تعمیر معبد ہائے خودمی سازند،(۵)

کفار ہند برملا مسجدوں کو منہدم کر رہے ہیں اور ان کی جگہوں پر اپنے معابد کی تعمیر کر رہے ہیں۔

اس کے بعد اسی خط میں بطور شاہد اپنے جوار کے ایک جزئی حادثہ کی غمناک خبر ان الفاظ میں دیتے ہیں:

درتانیسر دروں حوض کر کھیت مسجدی بود و مقبرۂ عزیزے آن را ہدم کردہ بجائے آن دیہرۂ کلاں راست ساختہ اند۔(۶)

کہ تھانیسر میں کرکھیت کے حوض میں ایک مسجد اور ایک معزز آدمی کی قبر تھی اس کو منہدم کر کے اس کی جگہ پر گردوارہ تعمیر کیا گیا۔

مذکورہ بالا خط کا اقتباس اس بات کا بین ثبوت ہے کہ مسلمانوں کی عبادت گاہیں اس وقت کی شر پسند طاقتوں کے نشانہ پر تھیں۔ ملک کے طول وعرض میں انہدام مساجد کی اندوہناک کاروائیاں حکومت وقت کی سرپرستی میں شر پسند ہنود کی طرف سے انجام دی جارہی تھیں اور افسوس تو اس بات کا تھا کہ بادشاہ وقت مسلمان تھا اور مسلمان لاچار ومجبور، حضرت مجدد صاحبؒ خود لکھتے ہیں افسوس صد ہزار افسوس بادشاہ وقت از ما است و ما فقیران باین زبونی وخرابی۔(۷)

اور صرف مسلمانوں کے عبادت خانوں کو ہی مسمار نہیں کیا جارہا تھا بلکہ مذہب پر چلنے کی آزادی بھی ان سے **سلب کرلی گئی تھی** چنانچہ جس دن ہنود برت (اپنے عقیدہ کے مطابق جب وہ کھانے پینے کے چھوڑنے کا اہتمام کرتے) رکھتے اس دن مسلمانوں کے ہوٹلوں پر بھی قفل پڑے رہتے تھے اس دن کوئی مسلمانوں بازار میں برسر عام نہ خورد ونوش کی کوئی چیز پکا سکتا تھا اور نہ فروخت کر سکتا تھا، اور اگر کوئی مسلمان بازار میں روٹی بھی بیچ لیتا تو اس کو مشق ستم بنا دیا جاتا تھا، اس کے برخلاف ماہ رمضان میں وہ برملا طعام کی خرید وفروخت کرتے اور کوئی بھی ضعف اسلام کی بنا پر ان کو منع کرنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ مندرجہ بالا خط ہی میں حضرت مجددؒ ہنود کی اس تشدد پسندی اور اسلام اور مسلمانوں کی زبوں حالی اور بیچارگی کا ماتم کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

روز ایکادسی ہنود کہ ترک اکل وشرب مینمایند اہتمام دارند کہ درآن روز در بلاد اسلام ہیچ مسلمانی در بازارنان نپزند ونفروشند، ودر ماہ مبارک رمضان برملا نان طعام میپزند ومیفروشند وہیچکس از زبونی اسلام منع آن نمی تواند(۸)

درحقیقت اس وقت مسلمان پورے ملک میں خوف وہراس کے عالم میں جی رہے تھے، ہندوستان کی سرزمین اپنی وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی تھی، وہ اپنے ہی ملک میں نام نہاد اسلامی حکومت کے زیر نگیں غربت کی

زندگی گذار رہے تھے، ذلت وخواری کے خونی پنجوں نے ان کے پورے وجود کولہولہان کر دیا تھا، ان کی عظمت کی فلک بوس عمارتیں اب زمیں بوس ہوچکی تھیں، ان کی شجاعت ودلیری کے واقعات داستان پارینہ بن چکے تھے، وہ شکست خوردہ قوم کی طرح محکومی ومغلوبی کی زندگی گذار رہے تھے اور کفران کی اس حالت زار پر خندہ زن تھا۔ حضرت مجددؒ نے اکبری دور کی اسی صورتحال کی منظر کشی جہانگیر کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے فوراً بعد شیخ فرید کو ایک ارسال کردہ ایک خط میں اس طرح کی ہے:

محمد رسول اللہ ﷺ کہ محبوب رب العالمین است مصدقان او ذلیل وخوار بودند ومنکران او بعزت واعتبار، مسلمانان بادلہای ریش درتعزیت اسلام بودند ومعاندان بسخریہ واستھزا بر جراحتھائ ایشان نمک می پاشیدند، آفتاب ہدایت درتتق ضلالت مستور شدہ بود ونور حق در حجب باطل منزوی ومعزول۔(۹)

محمد رسول اللہ ﷺ جو رب العالمین کے محبوب ہیں ان کے ماننے والے تو ذلیل وخوار تھے لیکن آپ کے منکروں کی عزت کی جاتی تھی، مسلمان زخمی دلوں کے ساتھ اسلام پر ماتم کناں تھے اور معاندین ان کا استہزاء اور مذاق اڑا کر ان کے زخموں پر نمک پاشی کرتے تھے آفتاب ہدایت ضلالت کے پردوں میں روپوش ہو چکا تھا اور نور حق باطل کے حجابات میں گوشہ نشیں ہو گیا تھا۔

اکبری دور میں الحاد وکفر کی ایسی گرم بازاری ہوئی کہ لوگ اپنے آپ کو فخریہ کافر کہنے لگے۔ عبدالرحیم خانخاناں کے دربار کے ایک مقرب شاعر نے بھی کفری لقب اختیار کر لیا تھا جب کہ وہ سادات کے خاندان سے تھا، چنانچہ ایک بار عبدالرحیم خانخاناں کا قاصد حضرت مجددؒ کے پاس ان کا خط لیکر آتا ہے، حضرت مجددؒ نے آنے والے اس قاصد کو خاص اہمیت دی اور اپنی توجہ وعنایات سے نوازتے ہوئے خانخاناں اور ان کے دربار کی صورتحال تفصیل سے پوچھی کیوں کہ ان ہی امراء کے دربار ان کی دعوت کے اصل مراکز تھے اور ان ہی امراء کے واسطے سے حضرت مجددؒ انقلاب عظیم کی راہ ہموار کررہے تھے۔ اس لیے ان امراء کے دربار سے بلاواسطہ یا بالواسطہ آنے والے سے پوری تفصیلی معلومات حاصل کرتے۔ اس قاصد نے اثناء گفتگو اس دل سوز خبر کا بھی تذکرہ کیا کہ دربار کے ایک شاعر نے کفری لقب اختیار کرلیا ہے، جگر کا خون کردینے والی اس خبر پر وہ انگشت بدنداں رہ گئے اور ان کا پورا وجود دریائے حیرت میں ڈوب گیا، اور معاً اس کے بعد جب اسی قاصد کے ہاتھ عبدالرحیم خانخاناں کو جوابی خط ارسال فرماتے ہیں تو اس قلب سوز خبر پر اپنے استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

العجب كل العجب ان الاخ الصادق قد نقل ان من جلسائهم من الشعراء الفضلاء من يلقب فى الشعر بالكفرى والحال انه من السادات العظام والنقباء الكرام فيا ليت شعرى ما حمله على هذا الاسم الشنيع البين شناعته والمسلم ينبغى له ان يفر من هذا الاسم زياد ةما يفر من الأسد المهلك ويكرهه كل الكراهة۔(۱۰)

کہ کس قدر کمال تعجب کی بات ہے کہ آپ کے ہمنشیں شاعروں میں سے ایک شاعر اپنے اشعار میں کفری لقب اختیار کرتے ہیں جب کہ ان کا تعلق

سادات عظام اور نقبائے کرام کے گھرانے سے ہے، میری سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے (کہ اس نے ایسا کیوں کیا) کس چیز نے اس شاعر کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ایسا اپنا نام رکھیں، جس کی شناعت وقباحت اظہر من الشمس ہے حالانکہ ایک مسلمان کو تو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ اس برے نام سے اسی طرح راہ فرار اختیار کرے جس طرح مہلک شیر سے فرار اختیار کرتا ہے اور اس سے مکمل نفرت وبراءت کا اظہار کرے۔

پھر نہایت لجاجت سے یہ رائے دیتے ہیں:

فالتمسوه من قبلی ان یغیره هذا الاسم ویبدله باسم خیر منه ویلقب بالاسلامی فانه موافق لحال المسلم ومقاله وانتساب الی الاسلام الذی هو الدین المرضی عند الله سبحانه وعند الرسول علیه الصلوة والسلام واجتناب عن التهمة التی امرنا باتقاء ه اتقوا مواضع التهم ، کلام صادق لاغبار علیه۔(۱۱)

کہ ان سے میری طرف سے درخواست کر دیجئے کہ وہ اس لقب کو بدل کر کوئی اچھا اور اسلامی لقب اختیا ر کریں کیونکہ مسلمان کے حال وقال کے موافق کوئی اسلامی لقب ہی ہوسکتا ہے۔اور ایسا نام ہو جس کی نسبت اس اسلام کی طرف ہو جو اللہ اور اس کے رسول کا پسندیدہ دین ہے اور تہمت کی جگہوں سے بچنا چاہئے جیسا کہ اس کا حکم ہے خود نبی کریم ﷺ نے فرمایا اتقوا مواضع التهم (تہمت کے مقامات سے بچو)۔

دور اکبری میں اسلام خفا کے ان پردوں میں چلا گیا تھا جہاں سے توحید کی کرنیں عام مسلمانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں ، اسلام کی زبوں حالی اور عام مسلمانوں کی اسلامی حالت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ شرک وتوحید کا حقیقی مفہوم ہی ان کے ذہنوں سے اوجھل ہو گیا تھا، بلکہ مسلمانوں کی اکثریت دین سے نابلد تھی ان کے پاس نہ شریعت کا صحیح علم تھا اور نہ دین کا درست فہم، کفر کے چڑھتے سورج نے ان کے قلوب میں اپنی یقین شکن اور ایمان سوز شعائیں پہونچادی تھیں ، مسلمانوں کے ایمان کا چراغ اس خورشید کفر کی چکاچوند روشنی معکوس کے سامنے مدھم پڑ رہا تھا، کفر کا ایک طوفان بلا خیز تھا جس نے ان کے ایمان کی عمارت کے در ودیوار ہلا کر رکھ دیے تھے بلکہ اس طوفان کی موج افزا لہروں میں وہ اس طرح بہنے لگے تھے کہ اصنام وطاغوت ان کی استعانت کا مرکز بن گئے تھے، ان کی جبین نیاز اب وحدہ لاشریک لہ کے بجائے ہاتھوں سے تراشیدہ مجبور وبیکس بتوں کے سامنے ناصیہ فرسائی کرنے لگی تھی۔ وہ قوم جس کو بتوں کو پاش پاش کرنے کے لئے مبعوث کیا گیا تھا اب بتوں کو ہی اپنا مسیحا اور مددگار سمجھنے لگی تھی، جب ان پر مصیبت کی باد تند وتیز چلتی یا کسی اور مرض میں مبتلا ہوتے تو ان کو خدا کے بجائے صنم یاد آتا۔حضرت مجددؒ نے صالحہ خاتون کو تحریر کردہ خط میں مسلمانوں کی بتوں سے محبت کا تذکرہ ان الفاظ میں اس طرح کیا ہے:

واستمداد از اصنام وطاغوت در دفع امراض واسقام کہ در جہلۂ اسلام شائع گشتہ است عین شرک وضلال است وطلب حوائج از سنگہائے تراشیدہ نا تراشیدہ نفس کفر وانکا راز واجب الوجود تعالی وتقدس۔(۱۲)

بیماریوں کو دور کرنے کے لئے بتوں اور

شیاطین سے مدد طلب کرنا جو آج مسلمانوں میں رائج ہوگیا ہے عین شرک وگمراہی ہے اور تراشیدہ یا ناتراشیدہ پتھروں سے حاجتیں طلب کرنا نفس کفر اور واجب الوجود حق تعالی وتقدس کا انکار ہے۔

شرک کی اس لعنت میں صرف مرد ہی گرفتار نہیں تھے بلکہ عورتوں کو بھی اس لعنت نے اپنے چنگل میں گرفتار کر لیا تھا اور یہ ناگفتہ بہ صورتحال اس درجہ کو پہنچ چکی ہے کہ عورتوں کی اکثریت بتوں کو اپنا مشکل کشا سمجھتی اور حاجت روائی کے لئے ان ہی کے سامنے دست سوال دراز کرتی۔ عورتوں میں سرایت کر چکے شرک کے متعلق حضرت مجددؒ کا بیان ملاحظہ ہو:

اکثر زنان بواسطہ کمال جہل کہ دارند باین استمداد ممنوع مبتلا اند وطلب دفع بلیہ ازین اسماء بے مسمی مینمایند وبادائے مراسم شرک واہل شرک گرفتارند۔(۱۳)

اکثر عورتیں اپنی انتہائی جہالت کی وجہ سے غیر اللہ سے جس مدد کے طلب کرنے کی ممانعت ہے اس میں مبتلا ہیں اور ان فرضی ناموں سے بلا دفع کرنے کی درخواست کرتی ہیں، جن کا کوئی مسمی نہیں، نیز وہ شرک اور مراسم شرک ادا کرنے میں گرفتار ہیں۔

عورتوں کی شرک کی جلوہ سامانیاں اور ان کے مشرکانہ عقیدہ کی عشوہ طرازیاں اس وقت قابل دید ہوتیں جب ملک میں چیچک کا مرض پھیلتا، اس وبائی مرض کے شیوع کے ساتھ ہی شرک کی وبا بھی مسلم معاشرہ میں خاص طور پر عورتوں میں عام ہوجاتی، اس وقت نیک وبد سبھی عورتیں مشرکانہ اعمال اور کفریہ مراسم کے ذریعہ اس مرض سے نجات کی سبیل تلاش کرتیں، اور خال خال ہی کوئی عورت اس وقت شرک کے اس سیلاب سے اپنا دامن بچا پاتی، اور بمشکل اپنے قلب وجگر میں ایمان کی شمع روشن رکھ پاتی، حضرت مجددؒ کی زبانی مسلم معاشرہ کی یہ تصویر ملاحظہ ہو:

علی الخصوص اتنمعنی از نیک وبد ایشان در وقت عروض مرض جدری کہ در زبان ہند یہ بہ سیتلہ معروف ست مشہود ومحسوس ست، کم زنی باشد کہ از دقائق این شرک خالی بود وبرسمی از رسوم آن اقدام ننماید الامن عصمھا اللہ تعالی:(۱۴)

خاص طور پر عوتوں سے یہ بات (شرک اور مراسم شرک کی ادائیگی) خواہ نیک ہوں یا بد، اس وقت ظاہر ہوتی ہے، جب چیچک کا مرض عارض ہو، جس کو ہندی میں سیتلہ کہتے ہیں۔ بہت کم عورتیں ہوں گی جو اس شرک کی برائیوں سے خالی ہوں اور چیچک کے رسوم میں سے کسی رسم کا ارتکاب نہ کرتی ہوں، بس اللہ جس کو محفوظ رکھے وہی بچتی ہوگی۔

مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد تو وہ تھی جو بتوں کو اپنا مشکل کشا سمجھ رہی تھی اور اسی سے فریادرسی کر رہی تھی، لیکن دوسری طرف مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد وہ بھی تھی جو نہ بتوں کے سامنے اپنی پیشانی خم کرتی تھی اور نہ ان کے نام پر قربانیاں پیش کرتی تھی لیکن وہ اولیاء اللہ، مشائخ عظام اور بزرگان دین کے ساتھ وہی روش اختیار کئے ہوئے تھے جو روش بتوں کے پرستار اپنے معبودوں کے ساتھ اپنائے ہوئے تھے۔ یہ دین سے ناآشنا بے چارے مسلمان اپنے بزرگوں کے نام پر جانور قربان کرنے کی منتیں مانتے اور پھر ان کی قبروں پر جاکر ان جانوروں کو ذبح کرتے تھے، ان کا عقیدۂ باطلہ تھا کہ بزرگوں کے نام پر اگر حیوانات کو ذبح کرنے کی

نیت کر کے کسی کام کی نذر مانی جائے گی تو وہ کام ضرور پورا ہوگا چنانچہ وہ اس قسم کی نذر اور منت مانتے اور جب ان کا کام پایہ تکمیل کو پہونچ جاتا اور ان کی ضرورت پوری ہوجاتی تو پھر قبروں پر لے جا کر جانور قربان کرتے، یہ بالکل وہی عقیدہ تھا جو کفار کا اپنے بتوں کے سلسلہ میں تھا۔ بس فرق قبلہ کا تھا کفار کا قبلہ بت تھے اور ان نام نہاد مسلمانوں کا قبلہ یہ اولیاء اللہ تھے جن کی اصل تعلیمات کو ہی ان مسلمانوں نے پس پشت ڈال کر ان کی قبروں اور مزاروں کو شرک کی آماجگاہ بنا دیا تھا۔ حضرت مجددؒ مسلمانوں کی تعمیر کردہ شرک کی اس عمارت کی کہانی ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں :

وحیوانات را کہ نذر مشائخ میکنند و بر سر قبر ہائے ایشان رفتہ آن حیوانات را ذبح مینمایند درروایات فقہیہ این عمل را نیز داخل شرک ساختہ اند ودرین باب مبالغہ نمودہ:(۱۵)

حیوانات کو جو مشائخ کی نذر کرتے ہیں اور ان کی قبروں پر لے جا کر ان جانوروں کو ذبح کرتے ہیں، فقہ کی روایات میں بھی اس عمل کو داخل شرک قرار دیا گیا ہے اور اس بارے میں بڑی شدید ممانعت بھی آئی ہے۔

یہ بات تاریخی شواہد کی روشنی میں کہی جاسکتی ہے کہ اس برہمن کدۂ ہند میں مسلمان اپنا اسلامی تشخص کھونے کے سفر پر چل پڑے تھے، فکر برہمن اور تہذیب برہمن مکمل طور سے ان پر اپنا تسلط قائم کر چکی تھی، برہمنی تہذیب کا اس قدر ان پر استیلا تھا کہ ہنود کے تہوار مسلمانوں کے تہوار بن گئے تھے، دیوالی کے موقع پر مسلمان اس تہوار میں کچھ اس طرح شرکت کرتے جیسے ان کا کوئی اپنا تہوار ہو،، اس موقع پر ایمان کے نور سے محروم ہو چکے مسلمان اپنے گھروں میں اہتمام سے قندیلیں روشن کرتے ،دیئے جلاتے اور پوری رات ان کے گھروں کی کھڑکیوں سے روشنی جھانکتی رہتی جو درحقیقت کفر کی اس آتش کا انعکاس تھی جو ان کے خرمن ایمان میں لگ چکی تھی، کون سی ایسی کافرانہ رسم تھی جو اس موقع پر جاہل مسلمان خصوصا عورتیں انجام نہ دیتی ہوں ،وہ کفار کی طرح اپنے بیٹیوں اور بہنوں کے گھر تحفہ تحائف بھیجتے تھے، کفار اس زمانے میں دیوالی کے موقع پر ایک خاص رنگ سے برتنوں کو رنگ کر اس میں سرخ چاول بھرتے اور اپنی بیٹیوں اور بہنوں کے گھر بھیجتے تھے، مسلمان بھی بعینہٖ اسی طرح کفر کے رنگ میں اپنے برتنوں کو رنگتے اور سرخ چاول سے پر کر کے اپنی بیٹیوں اور بہنوں کے گھر بھیجتے، حضرت مجددؒ کی زبانی ذرا یہ داستان کرب ملاحظہ فرمائے:

درایام دوالی کفار، جہلۂ اہل اسلام علی الخصوص زنان ایشان رسوم اہل کفر بجامی آرند وعید خود میسازند وہدایائے شبیہ بہدایائے اہل کفر بخانہائے دختران وخواہران در رنگ اہل شرک میفرستند وظرفہائے خود را در رنگ کفار دران موسم رنگ می کنند و بہ برنج سرخ آنہا را پر کردہ میفرستند وآن موسم را اعتبار واعتنا میدہند:(۱۶)

کافروں کی دیوالی کے موقع پر جاہل مسلمان خصوصا ان کی عورتیں کافروں کی رسوم بجالاتی ہیں، اسے اپنی عید سمجھتی ہیں، اہل شرک کی طرح اپنی لڑکیوں اور بہنوں کو ہدایا بھیجتے اور اپنے برتنوں کو کافروں کی طرح اس موسم میں رنگتے ،سرخ رنگ کے چاولوں سے بھر کر بھیجتے اور اس موقع کو قابل اہتمام توجہ سمجھتے ہیں۔

دربار اکبری سے جو کفر کا چشمہ جاری تھا اس میں

مسلمانوں کا ایمان خس وخاشاک کی طرح بہا جارہا تھا، اور نوبت بایں جارسیدہ بود کہ عبادات بھی اب خالصتہ اللہ کے لئے باقی نہیں رہی تھیں۔ اس میں بھی ہندوستان کے مسلمانوں نے دوسروں کو شریک بنالیا تھا، چنانچہ'' روزہ'' جیسی ایک اہم عبادت جس کے بارے میں حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ فرماتا ہے'' الصوم لی'' روزہ میرے لئے ہے، اب یہ روزہ صرف اللہ کے لئے باقی نہیں رہ گیا تھا بلکہ پیروں اور بیبیوں کے لئے بھی ہوگیا تھا اور پیر بھی فرضی تھے، یہاں تک کہ ان کے نام بھی یہ مسلمان خود ہی تراشتے تھے اور پھر ان فرضی ناموں کے پیروں کی نیت کرکے روزے رکھتے تھے، حضرت مجددؒ کے الفاظ میں ذرا شرک کا یہ نرالا انداز، خصوصا عورتوں کے متعلق، ملاحظہ ہو۔

وازیں معالم صیام نساء کہ بنیت پیران وبیبیان نگاہ دارند واکثر نامہائے ایشان را از نزد خود تراشیدہ روزہائے خود را بنام آنہا نیت کنند۔(۱۷)

اور اسی شرک کی قسم میں سے عورتوں کے وہ روزے بھی ہیں جو پیروں اور بیبیوں کی نیت کرکر رکھتی ہیں اور ان کے اکثر نام اپنی طرف سے تراش کر کے ان کے ناموں پر اپنے روزوں کی نیت کرتیں۔

ان روزوں کے اہتمام کا یہ عالم تھا کہ ان کے لئے باقاعدہ دن متعین تھے اور ہر دن کے افطار کے لئے مخصوص انداز میں الگ الگ متعین شدہ خاص خاص پکوان تیار کئے جاتے:

ودر وقت افطار از برائے ہر روزہ طعام خاص بوضع مخصوص تعین می نمایند وتعین ایام نیز میکنند از برائے صیام۔(۱۸)

ہر روزہ کے افطار کے وقت خاص طعام مخصوص طریقہ سے مقرر کرتیں اور ان روزوں کے لئے دن بھی متعین کرتیں۔

اور بسا اوقات تو عورتیں افطار کے وقت حرام چیزوں کا ارتکاب بھی کر بیٹھتیں یہاں تک کہ حرام مال سے افطار بھی کرتیں اور اسی کو اپنے لئے باعث سعادت اور مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتیں، چنانچہ بعض عورتیں ان روزوں کے افطار کے واسطے کاسہ گدائی لیکر پورے علاقہ میں در در چکر لگاتیں اور اسی بھیک سے حاصل شدہ ٹکڑوں سے ہی روزہ افطار کرتیں جب کہ ان کو دست سوال دراز کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہوتی تھی۔ اللہ نے ان کو وسعت دے رکھی تھی وہ اپنے پاس جمع شدہ مال سے بآسانی افطار کرسکتی تھیں لیکن ان کا یہ مزعومہ عقیدہ تھا کہ اگر بھیک کے ٹکڑوں سے افطار کریں گی تو ان کا یہ روزہ'' پیر صاحب'' کی خوشنودی کا ذریعہ ہوگا اور جلد ہی'' پیر جی'' ان کی ضروریات کی تکمیل کردیں گے، حضرت مجددؒ مختصر لیکن جامع الفاظ میں اس فعل حرام کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

بسا ست کہ در وقت افطار ارتکاب محرمات نمایند وافطار بامر حرام کنند وبے حاجت سوال وگدائی کنند وبآن افطار نمایند وقضائے حوائج خود را مخصوص بارتکاب این محرم دانند۔(۱۹)

بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ روزہ افطار کرتے وقت حرام امور کا ارتکاب کرتی ہیں اور حرام چیزوں سے روزہ افطار کرتی ہیں اور بے ضرورت سوال وگدائی کرتی اور اس سے روزہ کھولتی ہیں اور اپنی حاجتوں کے پورا ہونے کو ان محرمات کے ارتکاب

سے مخصوص سمجھتی ہیں۔

ان روزوں کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت مجددؒ فرماتے ہیں:

مطالب ومقاصد خود رابایں روزہا مربوط میسازند وتوسل ایں روزہا ازینہا حوائج خود میخواہند وروائے حاجات خودرا ازآنہا میدانند۔(۲۰)

اپنے مطالب ومقاصد کو ان روزوں سے وابستہ کرتی ہیں اور ان روزوں کے وسیلہ سے پیروں اور بیبیوں سے اپنی ضرورت طلب کرتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ ان ہی طرف سے ان کی حاجت روائی ہوتی ہے۔

شیطان کی ملمع سازی اور نفس کی فریب خوردگی کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی ان کے اس شنیع فعل پر تنقید کرتا تو شرک سے براءت کا اظہار کرتے ہوئے یوں گویا ہوتیں:

کہ ما ایں روزہا را برائے خدا نگاہ میداریم وثواب آنرا بہ پیران می بخشیم۔(۲۱)

کہ ہم یہ روزے خدا کے لئے رکھتے ہیں اور اس کا ثواب پیروں کو بخشتے ہیں۔

حضرت مجددؒ ان کی اس حیلہ سازی پر شدید جرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اگر درین امر صادق باشند تعین ایام از برائے صیام چہ درکار ست وتخصیص طعام وتعیین اوضاع شنیعۂ مختلفہ درافطار برائے چیست۔(۲۲)

اگر وہ اپنی بات میں سچی ہیں تو روزوں کے لئے دنوں کا تعین کس لئے ہے (کیا معنی)، کھانے کی تخصیص اور افطار میں مختلف قبیح طریقوں کی تعیین کی کیا حاجت ہے۔

یہ درحقیقت کچھ اور نہیں تھا بس خدا کے اس فرمان وما یؤمن اکثرھم باللہ الاوھم مشرکون کا جیتا جاگتا ثبوت تھا اور شرک بھی العیاذ باللہ ایسی عبادت میں جس کے بارے حدیث قدسی میں اللہ خود فرماتا ہے ''روزہ میرے لئے ہے'' یعنی اللہ کے علاوہ کسی اور کی روزہ میں شرکت کی گنجائش نہیں، ہر عام وخاص یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ ہر عبادت تو اللہ کے لئے ہے لیکن تمام عبادات میں روزہ کی تخصیص اس بات کی تاکید کے لئے گئی ہے کہ ہر عبادت کو شرک سے پاک رکھنا تو ضروری ہے لیکن عبادت صوم کی بنیاد تو اللہ اور اس کے بندے کے درمیان رشتوں کو مزید مستحکم اور توحید کی شمعیں مزید فروزاں کرنے کے لئے ہوئی ہے۔ لہٰذا اس عبادت کی شرک سے آمیزش بالکل نہ ہونا چاہئے اس کو خالص اور خالص خوشنودی خدا کے خاص رکھنا چاہئے لیکن افسوس دور اکبری کی مسموم کفر کی فضا سے یہ عبادت بھی شرک سے پاک نہ رہ پائی۔

یہ حال تو جاہل عوام کا تھا، دیندار طبقہ کا حال بھی کچھ بہتر نہ تھا، صوم وصلوۃ کے پابند لوگ دین کی صحیح غذا کے نہ ملنے کی بنا پر اس راہ پر کامل ومکمل طور پر گامزن نہ رہ سکے جس کی نشاندہی آقائے تاجدار ﷺ نے کی تھی۔ ذرا حضرت مجددؒ کی گواہیاں دینداروں کے متعلق ملاحظہ فرمائیں:

اکثر مردم خواص وعوام درین زمان درادائے نوافل اہتمام دارند ودر مکتوبات مساہلات مینمایند ومراعات سنن ومستحبات رادرآنہا کمتر میکنند نوافل را عزیز میدارند وفرائض را ذلیل وخوار، کم است کہ فرائض رادراوقات مستحبہ ادا نمایند ودرتکثیر جماعت مسنونہ بلکہ درنفس جماعۃ تقیدے ندارند وبتکاسل وتساہل اداء نفس فرائض راغنیمت می شمارند۔(۲۳)

اس زمانے کے اکثر خواص وعوام ادائے

نوافل کے اہتمام میں بڑی سعی کرتے ہیں لیکن فرائض میں کاہلی برتتے ہیں اور فرائض کی ادائیگی میں سنن ومستحبات کا لحاظ بہت کم کرتے ہیں، یہ لوگ نوافل کو بہت قیمتی خیال کرتے ہیں اور فرائض کی ان کی نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں ہے بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ فرائض کو مستحب اوقات میں ادا کریں، مسنون جماعت کے اضافہ کی ان کو فکر ہی نہیں رہتی ہے بلکہ جماعت کی پابندی ہی نہیں کرتے ہیں اور کاہلی اور سستی کے ساتھ نفس فرائض کی ادائیگی کو غنیمت شمار کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا اقتباس سے اس دور کے دینداروں کے دینی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایک طرف اگر نوافل کے اہتمام میں سعی کامل کی جاتی تو دوسری طرف فرائض کی ادئیگی میں کوتاہی، نوافل کی ادئیگی کو سب سے اہم فریضہ دین اور قربت الٰہی کا سب سے مقدس وسیلہ سمجھتے تھے جب کہ فرائض کی ادائیگی جماعت کے ساتھ تو دور کی بات، وقت مستحب میں بھی ادا کرنا ان کو گوارا نہ تھا۔

اسی طرح ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ مخصوص دنوں میں وہ نوافل کا اہتمام پوری تندہی کے ساتھ کرتے اور اس عمل کو بڑا نیک اور مستحسن سمجھتے تھے:

روز عاشورا وشب برات وشب بست ہفتم ماہ رجب واول شب جمعہ از ماہ مذکور کہ آن را لیلۃ الرغائب نام نہادہ اند کمال اہتمام را مرعی داشتہ بجمعیت تمام نوافل را بجماعت میگذارند وآنرا نیک ومستحسن می پندارند ونمیدانند کہ این از تسویلات شیطان است کہ سیئات بصورت حسنات مینمایند۔(۲۴)

یوم عاشوراء، شب برأت، رجب کی ستائیسویں شب اور ماہ رجب کی پہلی شب جمعہ کو جس کا نام لیلۃ الرغائب رکھ رکھا ہے، بہت اہتمام کے ساتھ ایک بڑی جماعت بنا کر نفل نماز ادا کرتے ہیں اور اس فعل کو اچھا سمجھتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ یہ سب شیطان کی ملمع کاری ہے جو برائیوں کو حسنات کی شکل میں پیش کرتا ہے۔

یہ تھے مکتوبات کے وہ چند اقتباسات جن سے اکبری دور میں اسلام اور مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ عیاں ہوتی ہے، اگر چہ یہ اقتباسات مختصر ہیں مگر اس دور کی ایک اجمالی تصویر ضرور ذہن کے پردوں پر مرتسم ہوسکتی ہے کہ کس طرح اسلام کے قلعہ کو مسمار کرنے اور مسلمانوں کے نام ونشان کو مٹانے کی منصوبہ بند سازشیں کی جارہی تھیں اور خود مسلمانوں کا ایمان پستی کی کس سطح پر پہنچ چکا تھا لیکن حضرت مجددؒ نے ایسے تاریک دور میں نہ صرف مسلمانوں کے اسلامی تشخص کی بقا کا فریضہ انجام دیا بلکہ حکومت کے قافلۂ ضالہ کو بھی ایمان کی شاہراہ پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔

دور حاضر میں مسلمانوں کے خلاف ہونے والی عالمی اور ملکی سازشیں حد درجہ دور اکبری سے مشابہت رکھتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان سازشوں کی بیخ کنی کا ایک مستحکم اور منظّم خاکہ امام ربانی کے عظیم تجدیدی کارنامہ کو سامنے رکھ کر تیار کیا جائے اور ان کی کامیاب جد وجہد اور مساعی جمیلہ سے استفادہ کرتے ہوئے مستقبل کے لئے مضبوط لائحہ عمل تیار کیا جائے جس سے نہ صرف اسلام مخالف طاقتوں کی ریشہ دوانیوں اور دجالی فتنوں کی تباہ کاریوں سے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت ہوسکے، بلکہ اشاعت اسلام اور اقامت دین کا بھی عظیم فریضہ ادا ہوسکے۔

☆☆☆

❑ تاریخ کے جھروکوں سے

قسط-۲

''اسلام میں مذہبی رواداری''

(مصنفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن)

ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

بنوامیہ اور رومی کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ رومیوں نے بنوامیہ کو کبھی چین نہ لینے دیا لیکن اس کے برخلاف بنوامیہ کی رواداری ان کے ساتھ جاری رہی، وہ لکھتے ہیں:

''بنوامیہ کی رواداری کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کے مفتوحہ علاقوں خصوصاً شام اور عراق میں دفتری زبان عربی کے بجائے رومی وفارسی ہی رہی، خراج کے محکمہ میں عربوں کے بجائے دوسری قومیں ہی سیاہ سپید کی مالک بنی رہیں۔ المامون ص ۱۶۱''۔ (ص ۱۶۱)

بنوامیہ کی علمی رواداریاں بہت مشہور ہوئیں مصنف نے مختصراً اسکا تذکرہ مقالات شبلی کی روشنی میں کیا ہے، پھر سسلی میں مسلمانوں کی حکومت کا جائزہ لیا ہے، سسلی میں عربوں کی حکومت میں دیگر قوموں کے ساتھ رواداری کے سلسلہ میں عیسائیوں کے اعترافات کو نقل کیا ہے، تمدن عرب کے مصنف کی تائیدیں جا بجا درج کی ہیں، انھوں نے ڈریپر کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس نے اعتراف کیا کہ عربوں نے یورپ کی عقلی اور دماغی ترقی کو بڑی تقویت پہنچائی اور ان کے تمدن کی وجہ سے پورا صقلیہ بڑا سرسبز بن گیا (ص ۱۳۰) صقلیہ میں عربوں کی حکومت دوسو برس قائم رہی اس عرصہ میں وہ یورپ کی ترقی کا ذریعہ بنتے رہے لیکن جب داخلی اسباب کے سبب شکست کھائی تو ان کے ساتھ عیسائیوں کی عدم رواداری کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:۔

''صقلیہ میں عربوں کی حکومت دوسو برس تک رہی مگر عربوں میں جب آپس میں نفاق اور اختلاف پیدا ہوا تو نارمنوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر ان سے جنگ کی، ۱۰۷۲ء میں عرب پلرموں کی لڑائی میں شکست کھا گئے، ان کو جس طرح تباہ کیا گیا وہ بھی ایک عیسائی مورخ کی زبانی سنیے، پلرموں میں پانچ سو مسجدیں تھیں، ان کو منہدم کر کے گرجا گھر میں تبدیل کر دیا، وہاں علماء صوفیہ، اور حکما کی جتنی قبریں تھیں، سب نیست و نابود کر دی گئیں، چارلس دوم کے زمانہ میں سسلی کے مسلمانوں کو زبردستی عیسائیوں کا پبتسمہ دے دیا گیا، نوسیرا اور بوسیرا کے مسلمانوں کی تعداد اسی ہزار تھی ان کو زبردستی عیسائی بنا لیا گیا، ساری جگہیں مسلمانوں سے خالی کرالی گئیں، اس کی تفصیل ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ ج ۹، ص ۸۳-۸۲ میں پڑھی جا سکتی ہے''۔ (ص ۱۳۳)

یہ حال ان کا صرف مسلمانوں کے ساتھ ہی نہیں رہا، بلکہ انہوں نے صقلیہ کے تمام رعایا کو اپنے مظالم کا نشانہ بنایا حتی کہ وہاں کے رعایہ نارمنوں کے ظلم و بربریت اور خونریزی کے عادی ہو گئے، (ص ۱۳۴)

اس موازنہ کو آگے بڑھاتے ہوئے اندلس کے مسلمان اور عیسائیوں کی تعمیری وتخریبی کارروائیوں کے ذریعہ رواداری کا

تجزیہ کیا گیا ہے، مصنف نے اندلس کا جغرافیائی تعارف کرایا ہے، پھر اسپین میں قائم عیسائی حکومت کے اذیت ناک مظالم پر روشنی ڈالی ہے، پھر وہاں کے مسلم حکمرانوں کے سیرت و کردار کے مثالی اور تعمیری پہلوؤں کے کچھ نمونے پیش کیے ہیں، عبدالرحمٰن ثالث کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''ایس بی اسکاٹ لکھتا ہے کہ عبدالرحمٰن ثالث نے رفاہ عام کے کام بڑے وسیع پیمانے پر انجام دئے او اپنے دربار میں بڑی شان و شوکت پیدا کی، ڈوزی لکھتا کہ عبدالرحمٰن ثالث کی فوج دنیا کی بہترین فوج تھی، یورپ کے فرماں روا اس سے سفارتی تعلقات رکھنے میں فخر کرتے، اس کی رواداری کا یہ حال تھا کہ ہر مذہب وملت کے لوگوں کو مشورہ کے لیے بلاتا، وہ ازمنہ وسطی کے بجائے موجودہ دور کا فرماں روا ہونے کے لایق تھا۔(ان تینوں حکمرانوں کے تفصیلی حالات تاریخ اندلس شایع کردہ دارالمصنفین میں ملیں گے)''

(ص۱۳۶-۱۳۷)

مسلمانوں نے اسپین کو ترقی دے کر جس طرح جنت ارضی بنایا اور دوسروں کے ساتھ جس طرح رواداری برتتے ہوئے حکومت کی اس کا اعتراف خود یورپ کے مصنفین نے کیا ہے، اس سلسلہ میں صاحب کتاب نے بڑے چیدہ چیدہ اقتباسات نقل کیے ہیں اور ان سے اپنے دعوے کو مدلل کیا ہے، اس پس منظر میں ان کے قلم سے نکلی ہوئی یہ سطریں پڑھئے:۔

''عربوں نے اسپین کو ترقی دے کر جس طرح اس کو یورپ کا زریں راج ہنس بنادیا وہ قوموں کی تاریخ کی ایک بہت ہی دلآویز کہانی ہے، فراخ دل یورپین مصنفوں نے اعتراف کیا ہے کہ مسلمان اسپین پہنچے تو انھوں نے اس کو علمی اور مالی ترقی کے لحاظ سے ایسا بدل دیا کہ یہ یورپ کا سرتاج بن گیا، انھوں نے عیسائیوں کو دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری برتنا، مفتوحوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا اور قول پر قائم رہنا، یورپ کے عیسائیوں کو سکھایا، نہروں کا جال بچھا کر وہاں کے بنجر علاقوں کو سرسبز وشاداب باغات میں بدل دیا، پارچہ بافی کو ایسی ترقی دی کہ یورپ میں یہیں کے کپڑے مقبول تھے، شکر، روئی، لوہے، اسپات اور کاغذ کے کارخانے کھول کر تجارت اتنی بڑھادی کہ ان کے تجارتی بیڑے بحر اسود اور بحر قلزم سے افریقہ اور مدغاسکر تک پہونچا کرتے تھے۔عربوں نے اسپین کو ترقی دے کر جس طرح زریں راج ہنس بنا دیا، اس کا اعتراف یورپ کے مؤرخوں نے اپنی تحریروں میں بھی کیا ہے''۔

(ص۱۳۸-۱۳۷)

اس کے بعد انہوں نے یورپی مؤرخین کی تحریروں کی روشنی میں مسلمانوں کے کمالات شمار کرائے ہیں، پھر ان ہی کے اقتباسات کے ذریعہ غرناطہ کی ترقی، الحمرا کے حسن اور قرطبہ کے عجائبات کا تذکرہ کیا ہے، پھر اندلس میں عیسائیوں کے مظالم کو قلم بند کیا ہے، اس باب کی ابتدا کرنے سے پہلے یہ مدلل تمہید دیکھئے:

''عیسائیوں کو عربوں کی حکومت اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ان کی مذہبی عدم رواداری کی وجہ سے پسند نہیں آتی، ایس بی اسکاٹ نے لکھا ہے کہ عیسائی ان عربوں سے آٹھ سو برس تک متواتر لڑتے رہے اور ان کو پانچ ہزار لڑائیاں لڑنی پڑیں، ظاہر ہے کہ اتنی طویل مدت تک وہی قوم دوسرے ملک میں جا کر حکومت کر سکتی ہے جس کے زیادہ تر فرماں روا اچھے رہے ہوں''۔(ص۱۴۷)

یہاں بھی مصنف نے کمال مہارت کے ساتھ انگریزی، فرانسیسی مؤرخین کی تحریروں کے ذریعہ عیسائیوں کے انتقامی اور انتہا پسندانہ مظالم کی تصویر پیش کی ہے، ان کی عدم رواداری کو واشگاف کیا ہے، عیسائیوں کے بدترین مظالم کا شکار اندلس کے یہودی بھی بنے، اس کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے ۱۴۸۱ء میں بنائے گئے انکیوزیشن جیسے جابرانہ مذہبی قانون کی تفصیلات درج کی ہیں

(ص۱۵۲)، اس قانون کی رو سے ان کے نزدیک جو ملحد ہوتا یا کیتھولک مذہب کا منکر ہوتا اس کو زندہ جلا دیا جاتا تھا، صرف یہی قانون عدم رواداری کے مکروہ چہرے کو سامنے لانے کے لیے کافی ہے، کیا مسلمانوں کی تاریخ میں اس کی کوئی ادنی سی مثال مل سکتی ہے ، اسی مبحث میں انھوں نے فرانس کے مسلمانوں پر عیسائی مظالم کا تذکرہ بھی کیا ہے جس کے جنوبی شہروں پر مسلمانوں نے غلبہ حاصل کیا تھا۔

موازنہ کی اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے مصنف نے رومن امپائر اور عباسی خلفاء کے باہمی معاملات کا تجزیہ پیش کیا ہے، اس ضمن میں مصنف نے رومیوں کی عدم رواداری اور متعدد عباسی خلفاء کی رواداری کا تذکرہ کیا ہے، خاص طور پر ہارون الرشید اور مامون الرشید کی روادرایوں کا ذکر کیا ہے ، ہارون رشید کی رواداری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''ہارون رشید نے اپنی رواداری میں ۸۰۱ء میں یروشلم کے عیسائیوں کو شارلی مین کی نگرانی اور اقتدار میں دے دیا تھا، اس کے باوجود اندلس کے عربوں کی حکومت اس کی نظروں میں کھٹکتی رہی، اس کے خلاف اس کی فوجی مہم جاری رہی لیکن وہاں کی طاقت ور حکومت سے بازی نہ لے جا سکا، ۸۱۰ء میں الحکم سے صلح کر کے خاموش ہو گیا''۔(ص۱۶۰)

مامون کے زمانے میں یونانی شہنشاہ تھیونی نس نے عباسیوں کی سرحد میں گھس کر مسلمانوں کا قتل عام کیا، مامون اس کا انتقام لینے کے لیے نکلا جب اس کی فوج شہنشاہ تھیونی نس کی سرحد میں داخل ہوئی تو اس نے پیام صلح بھیجا اور لکھا کہ وہ یہاں تک آنے کے اخراجات ادا کرے گا، قیدیوں کو بدون عوض رہا کرے گا اور رومی فوج کے ذریعہ جو عباسی شہر برباد ہوئے ان کی مرمت کرا دے گا ،مصنف گرامی لکھتے ہیں:۔

''یہ پیام مامون کے پاس پہونچا تو اس نے پہلے تو دو رکعت نماز پڑھی، گویا اس بات کا شکریہ ادا کیا کہ وہ رومی شہنشاہ دبنے کے لیے تیار ہے پھر اس نے سوچا کہ یہ شرطیں فتح کے مقابلہ میں کم نہیں ہیں، رومی شہنشاہ کو یہ کہلا بھیجا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح تم سے کہتا ہوں کہ تم اپنا تحفہ اپنے پاس رکھو، یہ بھی قبول نہیں کہ جو مسلمان تمہارے یہاں قید ہیں وہ رہا کر دئے جائیں کیوں کہ اگر وہ دین کے لیے لڑنے گئے تھے تو قیدان کے لیے مایہ فخر ہے اور اگر ان کا مقصد دنیا حاصل کرنا تھا تو وہ قید ہی کے مستحق ہیں، تیسری شرط بھی منظور نہیں کی کہ قید ہوتے وقت جس مسلمان عورت نے ہائے محمد کہہ کر پکارا ہوگا، اس کی اس دردناک آواز کو روم کے بڑے سے بڑے قلعے کے عوض میں بھی نہیں فروخت کر سکتا''۔(ص۱۶۲)

عباسیوں کی قلمرو میں غیر قوموں کو جو آزادی حاصل تھی اور ان کے ساتھ جو رواداری برتی جاتی تھی اس پر روشنی ڈالنے کے لیے مصنف نے علامہ شبلی کی کتاب المامون کا یہ اقتباس نقل کیا ہے جو واقعی مبنی بر حقیقت ہے:

''مامون کے عہد میں دوسری قوموں کو جو حقوق حاصل تھے، مہذب سے مہذب گورنمنٹ میں بھی اس سے زیادہ نہیں ہو سکتے، یہود، مجوس، عیسائی، لامذہب اس کی وسیع حکومت میں نہایت آزادی سے بسر کرتے تھے، خاص دارالخلافہ بغداد میں بہت سے گرجے نئے تعمیر ہوئے جن میں رات دن ناقوس کی صدائیں گونجتی رہتی تھیں، دربار میں ہر مذہب وقت کے علما و فضلا حاضر رہتے تھے اور مامون ان کے ساتھ نہایت عزت و توقیر سے پیش آتا تھا، جبرئیل بن بختیشوع ایک عیسائی تھا وہ اس کی اس قدر توقیر کرتا تھا کہ عام حکم دے دیا تھا کہ جو شخص کسی ملکی عہدہ پر مقرر کیا جائے، جبرئیل کی خدمت میں حاضر ہو، خراسان میں جو کالج بنوایا تھا اس کا پرنسپل یعنی مہتمم اعظم ایک عیسائی کو مقرر کیا جس کا نام یسوع

تھا''۔(ص۱۶۵)

مولانا شبلی کے ہی حوالے سے انہوں نے مامون رشید کا ایک اور واقعہ لکھا ہے جو واقعی بہت عجیب اور مامون کی حد سے زیادہ رواداری پر دلالت کرتا ہے:۔

''مامون کے ایک عزیز کا دوست عبدالمسیح بن اسحٰق کندی تھا، مامون نے اس کو نہایت نرم لفظوں میں ایک دوستانہ خط لکھ کر اس کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، عبدالمسیح نے اس کا جو جواب دیا وہ نہایت اشتعال انگیز تھا، اس کو عیسائیوں نے بعد میں ایک رسالہ کی صورت میں شایع کر دیا جو مولانا شبلی کی نظر سے گذرا، اس کو پڑھ کر وہ لکھتے ہیں کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کی نسبت جو الفاظ لکھے تھے ان کو پڑھ کر دل کانپ اٹھا مگر مامون کے سامنے یہ خط پیش ہوا تو اس نے پڑھ کر اس پر یہ لکھ دیا کہ جو مذہب دنیا کے کام کا ہے وہ زرتشت کا مذہب ہے، جو محض آخرت کے لئے مفید ہے وہ عیسائی مذہب ہے لیکن دین و دنیا دونوں کے لیے جو مذہب موزوں ہے وہ اسلام ہے۔''(ص۱۶۶)

اس کے بعد مصنف نے **آل سلجوق اور عیسائیوں** کے ساتھ ان کے سلوک کا ذکر کیا ہے، اس میں خاص طور سے الپ ارسلان کی رواداری جو اس نے شہنشاہ رومانوس دیوجانس کے ساتھ برتی جبکہ وہ قید ہو کر آیا تھا اس کی تفصیلات بیان کی ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ اس شاہی قیدی کے ساتھ اس نے جس طرح نرمی برتی اس کو زمین پر بیٹھنے نہیں دیا، اس سے نرم گفتگو کی اور اس سے تین مرتبہ ہاتھ ملایا، بحالت قید اس کو یہ یقین دلایا کہ اس کو اس کا سابقہ رتبہ واپس دلایا جائے گا، اور ان تفصیلات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے الپ ارسلان کے اس رویے کی تعریف اس کے متعصب دشمنوں نے بھی کی ہے۔

مصنف نے ایک عنوان **صلیبی جنگ** قائم کیا ہے، جس میں انہوں نے پہلے تو اس حقیقت کا اظہار کیا ہے جس کی طرف خود قرآن مجید میں جابجا اشارے کیے گئے ہیں کہ باوجود اپنے علم کے عباسیوں نے اسلام کو ایک الہامی اور آسمانی دین ماننے سے انکار کیا، ابتدا سے ہی اس کی حقانیت کے خلاف پروپیگنڈہ کیا، اس پر طرح طرح کے اعتراضات کیے، اس کے خلاف سازشیں کیں، اس کی تمام خوبیوں کا انکار کرتے ہوئے عیسائی مبلغین نے علمی، فکری نفسیاتی سطح پر مخالفت کی مہم چھیڑی، عیسائی مصنفین بالخصوص مستشرقین نے اسلام کو ایک وحشیانہ مذہب قرار دینے کی تحریک چلائی، آنحضرت ﷺ کی نبوت کا انکار کیا، کلام مجید کو خرافاتی داستان قرار دیا، اندلس کی انتہائی شاندار اور ترقی یافتہ حکومت کو عذاب الٰہی قرار دیا اور یہ الزام عائد کیا کہ آنحضرت ﷺ نے تلوار کے زور پر طاقت حاصل کی اور وحی کے نام پر دھوکہ دے کر اس کو برقرار رکھا، اس کے باجود اسلام اپنی گوناگوں انسانی خوبیوں کے سبب بڑھتا اور پھیلتا رہا تا آنکہ عیسائیوں نے اس کے خلاف میدان جنگ میں بھی مقابلہ آرائی شروع کر دی، صاحب کتاب نے لکھا ہے کہ ۱۰۹۶ء سے لے کر پانچ سو سال تک عیسائیوں نے آٹھ صلیبی جنگیں لڑیں، یہاں انھوں نے ان جنگوں کی تفصیلات سے گریز کیا ہے، البتہ عیسائیوں کی سفاکیت و بربریت اور مسلمانوں کی رواداری کا ذکر ضرور کیا ہے۔

عیسائیوں نے اس عرصہ میں جس طرح قتل عام کیا اس کی دلخراش داستان پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے، بقول مصنف وہ مقدس جہاد کے نام پر ایشیا پر ٹوٹ پڑے، بلغاریہ میں قتل عام کیا، ایشیائے کوچک میں دودھ پیتے بچوں کو قتل کیا، ہنگری اور بلغراد میں لوگوں کو مار مار کر ان کی ہڈیوں کا ڈھیر لگا دیا، ان کو اگر راستے میں کوئی مسلمان نہیں ملا تو یہودیوں کو قتل کیا، انطاکیہ پر تسلط ہوا تو مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا، دو ہزار ترکوں کے سر کاٹ کر فوجی کیمپ کے اردگرد نمائش کے لیے لگا دیے، زندہ انسانوں کو جلایا، عبادت گاہوں کو تاراج کیا، غرض اس طرح کے مظالم کی انتہا کر دی، مصنف نے انتہائی اختصار و جامعیت کے ساتھ یورپی مصنفین کے حوالوں سے

ان تفصیلات کو درج کیا ہے۔

پھر مسلمانوں کی رواداری کا تذکرہ کرنے کے لیے صلاح الدین ایوبی کا ذکر کیا ہے، اس کے ذکر کی ابتدا کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''صلاح الدین ایوبی جب فاتح ہوکر بیت المقدس میں داخل ہوا تو اس نے اپنی رواداری، فراخ دلی اور انسانی محبت کا جو ثبوت دیا اس کی تعریف یورپین مورخوں نے بھی کی ہے، ایڈورڈ گبن لکھتا ہے کہ انصاف کا تقاضا ہے کہ اس ترک فاتح کی رحم دلی کی تعریف کی جائے، اس نے مفتوحوں کو کسی مصیبت اور پریشانی میں مبتلا ہونے نہیں دیا، وہ ان سے بھاری رقمیں وصول کرسکتا تھا لیکن تیس ہزار کی رقم لے کر ستر ہزار قیدیوں کو آزاد کیا، دو تین ہزار کو تو اس نے رحم کھا کر یوں ہی چھوڑ دیا، اس طرح قیدیوں کی تعداد گھٹ کر گیارہ سے چودہ ہزار تک رہ گئی، جب یروشلم کی ملکہ اس کے سامنے آئی تو اس نے نہ صرف انتہائی مہربانی سے باتیں کیں بلکہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اس نے جنگ کے یتیموں اور بیواؤں میں خیرات تقسیم کی، جنگ کے زخمیوں کے علاج اور دیکھ بھال کے لیے ہر طرح کی سہولیتیں فراہم کیں، وہ قرآن کے دشمنوں کے ساتھ ہر طرح کی سختی سے پیش آنے میں حق بجانب تھا مگر اس نے جس فیاضانہ رحمدلی کا ثبوت دیا اس سے وہ صرف تعریف وتحسین بلکہ محبت کیے جانے کا مستحق ہے''۔(ص۱۸۵)

انھوں نے مستند ماخذ سے مدلل انداز میں صلاح الدین ایوبی کی رحمدلی اور عفو ودرگزر اور رواداری کے واقعات نقل کیے ہیں، صلاح الدین کے بھائی العادل نے ان سے ایک ہزار غلام مانگے اور جب ان کو دیے گئے تو سب کو آزاد کردیا، یہ اور اس طرح کے واقعات نقل کرکے پھر ان کے اخلاق کریمانہ کی تشریح کرنے والا ٹینلی لین پول کا یہ اقتباس نقل کیا ہے، ذرا آپ بھی دیکھیے:۔

''اب صلاح الدین نے اپنے امیروں سے کہا کہ میرے بھائی نے اپنی طرف سے اور بالیان اور بطریق نے خیرات کی، اب میں بھی اپنی طرف سے خیرات کرتا ہوں، یہ کہہ کر اس نے اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ شہر کے تمام گلی کوچوں میں منادی کردیں کہ تمام بوڑھے آدمی جن کے پاس زرفدیہ ادا کرنے کو نہیں ہے آزاد کیے جاتے ہیں کہ جہاں چاہیں وہ جائیں اور یہ سب باب العزر سے نکلنے شروع ہوئے اور سورج نکلنے سے سورج ڈوبنے تک ان کی صفیں شہر سے نکلتی رہیں، یہ خیر وخیرات تھی جو سلطان صلاح الدین نے بے شمار مفلسوں اور غریبوں کے ساتھ کی۔ اس کے بعد نائٹوں کی بیوائیں اور بیٹیاں سلطان کے پاس روتی ہوئی آئیں کہ وہ زرفدیہ ادا کرکے کہاں جائیں کیوں کہ ان کے شوہر یا تو قید خانہ میں ہیں یا مارے جا چکے ہیں ان کو روتے دیکھ کر خود سلطان کی آنکھوں میں آنسو آگئے ان کو تسلی دی، پھر ان کے شوہروں کو قید خانہ سے آزاد کیا اور جن کے شوہر مر چکے تھے انھیں خزانے سے اتنے روپے دلوائے کہ جہاں وہ گئیں سلطان کی فیاضی کا چرچا کیا۔'' (ص۱۸۹)

سلطان کی اس مثالی رواداری کے باوجود عیسائیوں نے بعد میں اپنی سفاکیت کا مظاہرہ کیا، وہ اپنی شکست کو بھلا نہ سکے، اس کے بعد پورے غیظ وغضب سے ۶ صلیبی جنگیں ہوئیں، مصنف نے **عیسائیوں کے انتقامی جذبات** کے عنوان سے اسی پہلو کا ذکر کیا ہے۔

پھر **دولت عثمانیہ اور عیسائی** کا باب ہے، اس میں بھی مصنف نے عثمانی سلاطین کی خوبیوں اور عیسائیوں کے ساتھ ان کے روادارانہ سلوک کو بیان کیا ہے، اختصار کے ساتھ متعدد سلاطین کی خوبیوں کو قلمبند کیا ہے، لیکن جواب میں عیسائی سلطنت عثمانیہ کی بڑھتی طاقت کو کبھی برداشت نہ کرسکے، انہوں نے ایک اتحاد بنا کر مسلمانوں کو یورپ سے نکالنے کا عزم کیا، (ص۱۹۶) (آج

بھی دیکھئے تو ہزار کوششوں کے باوجود یورپین یونین ترکی کو ممبر شپ دینے سے گریز کر رہی ہے،) عیسائی عثمانیوں سے ٹکراتے رہے مگر ان کو شکست فاش ہوتی رہی ، باجود اس کے کہ عثمانی قلمرو تاریخ میں دنیا کی سب سے بڑی امپائر کہلائی لیکن عثمانیوں کی رواداری پر اس سے فرق نہیں پڑا، سلطان مراد اول کے تذکرے میں مصنف لکھتے ہیں:

''مراد کے بارے میں یورپی مورخ لکھتے ہیں کہ جہاں بانی میں اپنی سختی کے باوجود نرم دل تھا، اس سے لوگ محبت بھی کرتے اور ڈرتے بھی، بہت کم بولتا اور جو کچھ کہتا اس میں بڑی گہرائی ہوتی۔اس نے مسیحی حکومتوں کو اپنے زیر نگیں ضرور کر لیا لیکن عیسائیوں کو پوری مذہبی آزادی دے رکھی تھی، اس کا ثبوت اس خط سے ملتا ہے جو ۱۳۸۵ء میں یونانی کلیسا کے بطریق اعظم نے پوپ اربن ششم کو لکھا تھا، بطریق مذکور نے اقرار کیا ہے کہ مراد نے کلیسا کو کامل آزادی دے رکھی تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۳۶۰ء سے ۱۳۸۹ء تک بطریق اعظم کے دفتر میں کوئی ایک شکایت بھی عثمانیوں کے ہاتھوں ارباب کلیسا کے ساتھ بدسلوکی کی درج نہیں ملتی''۔(ص ۱۹۷)

عثمانیوں کی فراخدلی ، سیر حاصل رواداری اور جواں مردی کا مظاہرہ ہوتا رہا ، عیسائی کبھی شکست کھاتے رہے کبھی معاہدے توڑتے رہے ، مصنف نے یہ سب تفصیلات مختصر طور پر درج کی ہیں، قسطنطنیہ کی فتح کا ذکر کیا ہے، اس تذکرے میں سے دو اقتباسات جو مصنف نے گبن کی مشہور زمانہ کتاب ڈکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر کے حوالے سے لکھے ہیں یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

''گبن کی تاریخ ڈکلائن اینڈ فال آف رومن امپائر میں ہے کہ محمد دوم فاتح جب قسطنطنیہ میں داخل ہوا تو لکس لوٹارس جو افواج قسطنطنیہ کا سپہ سالار اعظم تھا گرفتار کر کے اس کے سامنے لایا گیا، محمد نے نہ صرف اس کو معاف کر دیا بلکہ اپنی سرپرستی کا بھی یقین دلایا، اس کے ساتھ یہاں تک نوازش کی کہ اس کی بیوی کی عیادت کے لیے گیا جو علالت اور نئی مصیبت کے غم سے پریشان تھی، وہ اس سے نہایت نرمی اور احترام کے ساتھ ملا اور جس طرح کوئی لڑکا اپنی ماں کو سمجھائے اسی طرح تسلی و تشفی دی، ایسی ہی نرمی کا برتاؤ اس نے حکومت کے بڑے افسروں کے ساتھ کیا اور اس میں سے کئی ایک کا زر فدیہ خود ادا کیا اور چند ہی دنوں میں اس کے عفو و کرم کا دامن تمام باشندگان شہر تک دراز ہو گیا۔ (ڈکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر ج ۴، ص ۵۰۱)۔قسطنطنیہ کی فتح کے بعد سلطان محمد جس وقت یہاں داخل ہوا تو اس کا ذکر لارڈ ایور سلے نے اپنی کتاب ٹرکش امپائر میں اس طرح کیا ہے کہ اگر چہ سلطان اور اس کے سپاہیوں نے بہت سے مظالم کیے اور یونانیوں کی پوری جماعت پر نہایت سخت مصیبت ٹوٹ پڑی، تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قسطنطنیہ کی فتح کے موقع پر ویسی نفرت انگیز بدمستیوں کا مظاہرہ ہوا جیسی ۱۲۰۴ء میں دیکھی گئی تھی، جب کہ صلیبی محاربین نے اس پر قبضہ کیا تھا، داخلہ کے ابتدائی چند گھنٹوں کے بعد اس موقع پر کوئی قتل عام نہیں ہوا، آتش زنی بھی زیادہ نہیں ہوئی، سلطان نے گرجاؤں اور دوسری عمارتوں کو محفوظ رکھنے میں پوری کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب رہا (ایور سلے ص ۸۸، دولت عثمانیہ ج ۱ ص ۱۱۰)''۔(ص ۲۰۶-۲۰۷)

فتح قسطنطنیہ پر جس انسانیت نوازی اور فراخ دلی کا ثبوت دیا گیا وہ اپنی مثال آپ ہے ، خود عیسائیوں نے جب قسطنطنیہ فتح کیا تھا تو ظلم کا بازار گرم کر دیا تھا ، اس رواداری کے باجود عیسائیوں نے سقوط قسطنطنیہ کا بدلہ اندلس میں مسلمانوں سے ۱۴۹۳ء میں لیا ، وہاں سے مسلمانوں کو جس طرح بے دخل کیا اور سفاکیت کا جو رویہ اپنایا اس کی مثالیں تاریخ میں نہیں ملتیں، تاریخی

بیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر چہ قسطنطنیہ میں عیسائیوں کے ساتھ بہیمانہ سلوک نہیں کیا گیا مگر اندلس میں مسلمانوں کے ساتھ کی گئی درندگی پر عام طور پر عیسائی خوش تھے کہ انہوں نے اندلس میں قسطنطنیہ کا بدلہ لے لیا۔

سلیمان اعظم قانونی بلا اختلاف اپنے وقت کا سب سے بڑا تاجدار اور شہنشاہ تھا، لیکن اس کی عدل پروری اور رواداری معروف تھی، مصنف لکھتے ہیں:

''اس نے اپنی غیر مسلم رعایا کے لیے لگان وغیرہ کے جو قوانین مرتب کیے تھے، اس بنا پر جاگیر دار واجب ادائیگی سے زیادہ مستحق نہ تھے، اسی لیے ایڈورڈ کریسی نے لکھا ہے کہ سلطان کے ایک معاصر مورخ کا بیان ہے کہ سرحدی عیسائی ممالک کے باشندے بھاگ بھاگ کر سلطنت عثمانیہ میں پناہ لیتے تھے اور اپنے ہم مذہب عیسائی آقاؤں کے جور وتعدی پر ترکوں کی نرم حکومت کو ترجیح دیتے تھے، یہاں آکر خوش رہتے کہ عشر کے علاوہ ان پر اور کسی قسم کا محصول یا تکلیف دہ بار عائد نہیں کیا جاتا''۔(ص۲۰۹-۲۱۰)

واقعہ یہ ہے کہ سلیمان اعظم قانونی جس بلند پائے کا بادشاہ تھا اور اس نے سلطنت عثمانیہ کو جس عروج تک پہنچا دیا تھا اس کو سنبھالنے والا اس کا وارث بھی اسی سطح کا ہونا چاہئے تھا، مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا، اس کے بعد ترک سلطان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر عیسائیوں نے اپنی چیرہ دستیوں کا مظاہرہ کیا، سلیم ثانی کے زمانے میں ۱۵۹۳ء میں مولڈ بویا، ولاچیا اور ٹرنسلوینیا پر قبضہ ہوا تو وہاں کے تمام مسلمانوں کو قتل کر دیا (ص۲۱۳) مصنف نے مختلف عثمانی سلاطین کے زمانوں میں عیسائی کارروائیوں، بدعہدیوں اور ان کی انتقامی جنگوں کا جائزہ لیا ہے، اسی طرح عثمانیوں کی شرافت اور ان کے اخلاق شریفانہ کے خلاف عیسائیوں کے معاندانہ اقدام اور ان کے تعصب کی مفصل و مدلل مثالیں پیش کی ہیں، روس کی حریصانہ بد عہدیوں کا ذکر ہے، خود عیسائی حکومتوں کے درمیان باہمی تعلقات میں موجود نفاق کو بیان کیا گیا ہے، انقلاب فرانس کے اثرات کا بھی تذکرہ ہے، **محمود ثانی سے نپولین کی غداری اور عیسائی حکومتوں کی تخریب کارروائیوں** کو بیان کرتے ہوئے مصنف نے آخر میں سلطنت عثمانیہ میں عیسائیوں کو حاصل مراعات کا بھی تذکرہ کیا ہے:

''ایک دوسرا یورپی مورخ ایلیسن فلپس لکھتا ہے کہ سلطان کی عیسائی رعایا اپنے مذہبی ارکان کے ادا کرنے، دولت جمع کرنے اور تعلیم حاصل کرنے میں بالکل آزاد تھی، عیسائی کلیسا نیز حکومت کے اونچے درجے تک ترقی کر سکتا تھا، ایک عیسائی کسی صوبہ کا گورنر بھی ہو سکتا تھا، عثمانی حکومت میں کسانوں کا درجہ اٹھارہویں صدی میں یورپ کے اکثر حصوں سے کہیں بہتر تھا، زرعی غلامی جو تمام عیسائی یورپ میں تقریباً عالمگیر تھی، ترکی میں مفقود ہو چکی تھی اور ترکی مملکت کے بہت سے حصوں میں کاشتکاروں کو ایسی خوش حالی حاصل تھی کہ اس سے بعض ان قوموں کے کسان جو زیادہ مہذب سمجھے جاتے تھے، واقف بھی نہ تھے۔ (دی والوف گریک ان ڈی پنڈنس از ایلیسن فلپس ۱۸۹۷ء ایڈیشن، تاریخ دولت عثمانیہ ج۲، ص۲۳)۔ یہ ساری رعایتیں عثمانی سلطنت میں نہ صرف یونان کے عیسائیوں کو حاصل تھیں بلکہ ان تمام علاقوں میں بھی رائج تھیں جہاں عیسائی آباد تھے مگر یورپ کی بڑی عیسائی حکومتوں کو عثمانی سلطنت سے ازلی دشمنی تھی، اس لیے جہاں اور علاقوں کے عیسائی باشندوں کو اس کے خلاف ابھارا، وہاں یونانیوں کو بھی اس کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کیا، روس کے پیٹر اعظم اور ملکہ کیتھرائن دونوں نے یونان کو اپنا آلۂ کار بنانے کی کوشش کی اور اس کو یقین دلایا کہ روس اس کو مکمل آزادی دلا دے گا اور جب عثمانی فوجیں یانینا کے والی علی پاشا کی سرکوبی میں مشغول ہوئیں تو یونانیوں نے باغیانہ روش اختیار کی جس کی پوری مدد روسیوں نے کی''۔(ص۲۳۳-۲۳۴)

(جاری.....)

☆☆☆

❑ نظریۂ جہاد

اسلام کا نظریۂ جہاد

تحریر: محمود شیت خطاب
ترجمہ: محمد سہیل ندوی
(استاذ: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ)

جہاد کے معنی ہیں: دشمن سے جنگ کرنا(۱) ، اور اسلامی جنگ کا مقصد اسلامی انقلاب کی دعوت کی نشر واشاعت اوراس کی تبلیغ کے راستہ میں ہرآنے والے روڑے کو ہٹانا۔

مسلمانوں کا مکی دور بڑا گراں اور جان لیوا گزرا، کیسے کیسے مصائب وآلام تھے، کیسے کیسے ظلم روا رکھے گئے، ذرا تصور کیجئے، اوراس عہد میں جا کر ذرا اس نقشہ کی منظر کشی کی کوشش کریئے، کیسی شرارتیں، کیسی عداوتیں، کیسی تکلیفیں، احساس دل اگراس کوسوچ لے تو جسم کا رواں رواں کانپ اٹھے، ایسے حالات میں داعی حق نے اپنے مشن کو جاری رکھا، اوراس کی تبلیغ ونشر و اشاعت کے لیے کوشاں رہے، اوران تمام حالات سے جوجھنے کا مقصد صرف ایک تھا، اور وہ تھا پرامن معاشرہ، ظلم وزیادتی سے پاک معاشرہ اوران کی ایک ہی پکار تھی، کہ ہمارا رب اللہ ہے۔

لیکن دشمنانِ اسلام کی زیادتیاں کہاں تھمنے والی تھیں، ان میں روز بروز اضافہ ہی ہورہا تھا، اور حالات اتنے ابتر ہوتے چلے جارہے تھے کہ شریعت کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کا فیصلہ بھی کرلیا گیا، اوروہ استیصال شریعت پر اتر آئے، تب آپ کے جان نثاروں نے مدینہ منورہ کا قصد کیا، اور مدینہ آنے سے یہ زیادتیاں کیا بند ہوگئیں، کچھ راحت ملی؟ نہیں ہرگز نہیں، قریش اور دشمنانِ اسلام مسلمانوں سے برسر پیکار ہی رہے اور جانی و مالی نقصان پہنچاتے رہے، تب اللہ کا اذن عام ہوا، اور حکم دیا گیا:

أذن للذين يقتلون بأنهم ظلموا وإن الله على نصرهم لقدير الذين أخرجوا من ديارهم بغير حق إلا أن يقولوا ربنا الله۔ (جن (مسلمانوں) سے جنگ کی جارہی ہو ان کو بھی اب (جنگ کی) اجازت دی جاتی ہے اس لیے کہ ان کے اوپر بہت ظلم ہوچکا، اور اللہ ان کی مدد پر بھرپور قدرت رکھتا ہے، جن کو ناحق ان کے گھروں سے صرف اس لیے نکالا گیا کہ وہ کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے۔

اور پھر بنفس نفیس اللہ کے رسولؐ غزوہ کی نیت سے نکلے۔ اس طریقہ سے اسلام کے اندر جنگ کا آغاز ہوا، اور عملی طور پر کارروائی شروع ہوئی۔

اسلامی جنگ کا مقصد:

اسلامی جنگ کا مقصد صرف دعوت کی تبلیغ وترویج نہیں ہے بلکہ دعوت کی ترویج کی آزادی ہے اوراس کے راستہ میں آنے والی ہر روڑے کو دور کرنا ہے تاکہ ہر بندۂ خدا کے سامنے اس کو پیش کیا جائے اوراس کو راہِ راست پر گامزن کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ اگر دعوت کو پھیلانا مقصود ہوتا تب تو یہ اکراہ کی صورت اختیار کر جاتا حالانکہ دین اسلام کے اندر کوئی

(۱) جہاد- جہد سے مشتق ہے اور جہد کے معانی ہیں مشقت برداشت کرنا، اور جہاد کے معنیٰ ہیں کسی کام کے کرنے میں پوری طرح کوشش کرنا اور کسی قسم کی کمی نہ کرنا۔ (تاج العروس)

مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں: جہاد کے معنی عموماً قتال اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے۔ لغت میں اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہیں۔ (سیرۃ النبی جلد ۵، صفحہ ۲۱۰)

اجبار واکراہ نہیں ہے، حقائق ہیں، سچی باتیں ہیں، ہدایات ہیں، جو نجات کا متلاشی ہو وہ اس کو قبول کرلے ورنہ دوسرے مختلف راستے ہیں، "لا إكراه فى الدين" دین اسلام میں کوئی جبر نہیں ہے اگر اسلام کے اندر جبر مقصود ہوتا تو نیزے اور تلواروں کے ذریعہ قبول کرالیا جاتا لیکن اس صورت میں اس نظریہ کے ساتھ اسلام کی وہ جامعیت وآفاقیت دب کر رہ جاتی جس کو صحیح معنوں میں اسلام پیش کرنا چاہتا ہے کیونکہ جب تک بادشاہ اور ان کی گرفت رہتی، لوگ بھی اسلام کو اپنے یہاں جگہ دینے کے لیے تیار رہتے، اور اس کو قبول کرتے، لیکن موقع ملتے ہی، حکومت وسلطنت کے زوال پذیر ہوتے ہی وہ نعوذ باللہ مرتد ہوجاتے، اور وہ غالب آجاتے، کیونکہ اسلامی جنگ کا مقصد صرف دعوت اسلامی کی تبلیغ نہیں ہے بلکہ اس تبلیغ دین کی آزادی کے راستے میں آنے والی ہراڑچن والجھن اور مخالف طاقت کی سرکوبی ہے، اور مسلمانوں کے ممالک اور شہروں کو خارجی حملوں اور فتنوں سے محفوظ رکھنے کا مؤثر ترین ذریعہ ہے، اللہ رب العزت کا ارشاد ہے، وقاتلوا فى سبيل الله الذين يقاتلونكم ولا تعتدوا، إن الله لا يحب المعتدين (اور اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور حد سے تجاوز مت کرنا، یقیناً اللہ تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ہے۔)

اسلامی جنگ کا مطلب دوسرے کو اذیت پہنچانا نہیں ہے، بلکہ وہ ایک دفاعی نظام ہے کیونکہ مسلمان اپنی ذات کی طرف سے کسی پر ظلم وزیادتی کو جائز نہیں سمجھتے ہیں یا کوئی بھی ایسا عمل روا نہیں سمجھتے جو عزت وناموس کے خلاف ہو۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا بلکہ وہ عہد کے پکے اور امانتوں کے پاسدار، اور غمزدہ و پریشان حال، بے بسوں و بے کسوں کی غمخواری کرنے والے ہوتے ہیں اور بچوں، معصوموں، مجبوروں، معذوروں اور عورتوں، بوڑھوں، غلاموں، کسانوں، مزدوروں جیسے طبقہ سے چھیڑ چھاڑ نہ کرنے اور نہ الجھنے کی تعلیم کا نام ہی اسلام اور اس پر عمل کرنے والے مسلمان کہلاتے ہیں۔

امن وامان اور سکون کے ذرائع واسباب:

کوئی بھی نوخیز ریاست، نوتشکیل یافتہ معاشرہ کا اگر اپنا کوئی عسکری نظام نہ ہو تو پھر اس قوم کے ضائع ہونے اور برباد ہونے کے امکانات مزید بڑھ جاتے ہیں کیونکہ پھر دشمن اس پر جری ہوتا ہے اور ہر وقت وہ حملہ کی ادھیڑبن میں رہتا ہے، اور کسی بھی موقع کو گنواتا نہیں ہے، اس کے برعکس اگر عسکری نظام کا اہتمام ہو اور اس قوم کا اپنا ایک فوجی نظام ہو تو پھر دشمن مرعوب ہوتا ہے اور خوفزدہ رہتا ہے۔ بہت جلدی حملہ کے لیے آمادہ نہیں ہوتا اور اسی فوجی نظام سے نتیجتاً امن وامان رہتا ہے، سکون کی فضا پروان چڑھتی ہے، ماحول سازگار ہوتا ہے، اللہ کا ارشاد ہے: "وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة و من رباط الخيل ترهبون به عدو الله و عدوكم و آخرين من دونهم، لا تعلمونهم الله يعلمهم وما تنفقوا من شئ فى سبيل الله يوف إليكم و أنتم لا تظلمون، و إن جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله، اور دوسری جگہ ارشاد ہے: يا ايها الذين آمنوا ادخلوا فى السلم كافة۔ (اور ان کے لیے طاقت سے اور گھوڑے پال کر ہر ممکن تیاری کرو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں پر دھاک بٹھا سکو اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی، جن کو تم نہیں جانتے۔ اللہ ان کو جانتا ہے، اور اللہ کے راستہ میں تم جو بھی خرچ کروگے وہ تمہیں پورا پورا مل جائے گا اور تمہارے ساتھ کچھ بھی ناانصافی نہ ہوگی اور اگر صلح کے لیے وہ جھک جائیں تو آپ بھی اس کے لیے جھک جائیں اور اللہ پر بھروسہ رکھیں.....اور اے ایمان والو! اسلام میں مکمل داخل ہوجاؤ، ادھورے نہیں۔

مذہب اسلام کا مطلب ہی سلامتی والا دین ہے، سلم سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی یہی سلامتی اور امن کے ہیں، وہ امن وامان اور سلامتی کا ضامن ہے، اور اسی کی پرزور تاکید وتلقین کرتا ہے، اس کی اساس اور بنیاد محبت ومودت اور چشم پوشی وعفو ودر

گزر پر قائم ہے۔

جنگ کی اجازت اور اس کا مکمل ہونا یا جنگ کے حالات بننا بالکل اس موقع کے لیے ہے جب اس کے بغیر چارہ کار(۱) نہ ہو۔ حالات ناگفتہ بہ ہوتے چلے جارہے ہوں، ظلم کو ظلم اور زیادتی کو زیادتی سمجھنے والا کوئی نہ ہو، تب حالات کی سازگاری اور قابو میں لانے کے لیے جنگ کی اجازت ہے۔

اسلامی قتال کی قسمیں

مسلمانوں کی مسلمانوں سے جنگ:

یہ بھی قتال اور جنگ ہی کی ایک قسم ہے، یہ مسلمانوں کی اندرونی وداخلی کیفیت کا نام ہے، قرآن کریم جنگ کی اجازت دیتا ہے جب مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں بغاوت پر آمادہ ہوں، یا کسی نظام کو اختیار نہ کرنے کی صورت میں ان سے قتال کر کے یا جنگ کر کے اس بغاوتی نظام کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے، یا حاکم اور محکوم کے درمیان ناچاقیاں ہوں، اختلافات ہوں اور رعایا کو اور تمام لوگوں کو ان اختلافات سے بچایا جائے اور امت کی وحدت وتضامن کا خیال رکھا جائے، تاکہ شیرازہ منتشر نہ ہو بلکہ یکجائی قائم رہے، اللہ کا ارشاد ہے، "وإن طائفتان من المؤمنين اقتتلوا فأصلحوا بينهما، فإن بغت احداهما على الاخرىٰ فقاتلوا التى تبغى حتى تفئ إلىٰ أمر الله، فإن فاء ت فأصلحوا بينهما بالعدل وأقسطوا، إن الله يحب المقسطين، إنما المؤمنون إخوة فأصلحوا بين أخويكم، المؤمنون إخوة فأصلحوا بين أخويكم، واتقوا الله لعلكم ترحمون۔

(اور اگر اہل ایمان میں دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان دونوں میں میل ملاپ کرادو، پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کے لیے جھک جائے، پس اگر وہ جھک جائے تو پھر دونوں میں برابری سے صلح کرادو اور انصاف سے کام لو، بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔)

اس آیت میں معاشرہ میں سکون وامن کی راہ ہموار کرنے کی ہدایت دی جارہی ہے کہ ایک تو خود لڑائی جھگڑا نہ کرے اور اگر آپس میں جھگڑے کی نوبت آجائے تو صلح صفائی کی حتی الامکان کوشش کی جائے اور اس کے لیے طاقت کا استعمال اگر مفید ہو تو طاقت کا بھی استعمال کیا جائے۔ اس سے دریغ نہ کیا جائے، جب تک زیادتی کرنے والا فریق اللہ کے حکم کے آگے، اس کی آسمانی تعلیمات کے آگے سر تسلیم خم نہ کردے، دونوں فریقوں میں کوئی بھی فریق جب تک تمرد وعصیان اور بغاوت پر آمادہ ہے اور باغیانہ تیور اختیار کرتا چلا جائے تو ایسی صورت میں اس سے جنگ کی جائے جب تک وہ اسلامی تعلیمات کو تسلیم نہ کرلے۔ یہ اسلامی قانون ہے اور اس قانون کا مقصد وحدت امت ہے، امت کی شیرازہ بندی منتشر نہ ہو، کیونکہ اسلامی جنگ امن وامان کی راہ ہموار کرتی ہے اور بغاوت وسرکشی کا قلع قمع کرتی ہے اور اس قسم کی تمام چیزوں کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکتی ہے۔

مسلمانوں کی غیر مسلموں کے ساتھ جنگ:

غیر مسلموں کے ساتھ جنگ کا مقصد صرف اور صرف اسلامی ممالک یا اسلامی علاقوں سے عدوان وسرکشی کا استیصال اور دعوت اسلامی کی پشت پناہی ہے اور اقامت وتبلیغ دین ہے۔ اور قرآن کریم کسی لالچ یا کسی مادی عہدہ یا منصب یا کسی علاقہ پر قابض بننے کے لیے یا غریبوں، مسکینوں، کمزوروں کو ذلیل اور ان کی رسوائی کے لیے جنگ کا اعلان نہیں کرتا ہے، بلکہ وہ اس

(۱) لیکن اسلامی نظریۂ جہاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی حملہ کرے تو چارو ناچار اس کا سامنا کرلیا جائے بلکہ وہ یہ رہنمائی دیتا ہے کہ اسلامی انقلاب کے داعی اپنی ریاست کے ایک ایک ذرہ کی حفاظت کا انتظام کریں، وہیں دوسری طرف لاکھوں بندگان خدا کو ظلم، جہالت، معاشی، خستہ حالی اور اخلاق پستی سے نکالنے اور انقلاب کی تکمیل کرنے کے لیے انقلاب دشمن طاقتور کی سرکوبی کریں۔

نظام کے ذریعہ امن وامان کی اور چین وسکون کی چولہوں پر معاشرہ کو کھڑا کرنا چاہتا ہے، تاکہ معاشرہ عدل وانصاف سے آشنا ہو، اور رہی بات جزیہ کی تو جزیہ کا نظام عقیدہ کے مختلف ہونے یا کسی کا خون بہائے جانے کے بدلہ میں یا اس کے عوض میں نہیں ہے، یعنی اگر کوئی شریعت اسلام کے عقیدہ سے متفق نہیں ہے اور اس کا تعلق کسی دوسرے مذہب یا دین سے ہے تو صرف اختلاف دین کی وجہ سے اس سے مال کی ایک رقم وصول کی جائے گی، نہیں، ہرگز نہیں بلکہ جزیہ کا مقصد مفتوح ومغلوب اقوام کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت ہے اور ذمیوں اور مسلمانوں کے مابین تفریق وبھید بھاؤ کا امتیاز اور اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ سب کے ساتھ معاملہ برابر ہو اور سب کے حقوق مساویانہ ہوں۔ اسلام سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے، یکساں سلوک کرتا ہے، اسلامی جزیہ کا نظام مغلوب اقوام سے انتقام لینے کے لیے بغض وعناد پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ مغلوب اقوام سے جزیہ وصول کرنے کا مقصد ان کے عقائد، ان کے اموال اور عزت و ناموس کی حفاظت ہے۔

اس کی بڑی مثال اور اس طرح کا معاہدہ مسلمانوں کے قائد عظیم سپہ سالار خالد بن ولیدؓ نے ''ناطف'' نامی عیسائی پادری کے ساتھ کیا تھا، جس کے الفاظ ہیں ''میں نے آپ لوگوں سے جزیہ اور حفاظت کا معاہدہ کیا ہے، اگر ہم آپ کی حفاظت کریں تو ہم جزیہ لینے کے مستحق ہوں گے، ورنہ عدم حفاظت کی صورت میں ہم جزیہ لینے کے حقدار نہیں ہوں گے، جب تک ہم آپ کی حفاظت نہ کریں''۔ اور ہمیشہ اسلام کے اندر جزیہ اسی اصول کی بنیاد پر وصول کیا گیا ہے جن کو ہم نے اوپر بیان کیا ہے، اور جو شخص بھی تعلیمات اسلام سے ذرہ برابر بھی واقفیت رکھتا ہے، وہ یہ جانتا ہے کہ خالد بن ولید نے اہل حمص اور ابوعبیدہ ابن جراح نے اہل دمشق کا جزیہ ان کو ہی واپس کر دیا تھا اور دیگر تمام اسلامی سپہ سالاروں نے مفتوحہ شہروں کے باشندوں سے جو جزیہ لیا تھا، وہ سب واپس کر دیا تھا اور ان سے صاف بیان بھی کر دیا کہ ہم نے آپ کے جان و مال اور عزت وآبرو کی حفاظت کے لیے آپ سے جزیہ لیا تھا اب ہم آپ کی حمایت وحفاظت سے عاجز ہیں، آپ جزیہ کی دی ہوئی رقم واپس لے لیں۔ اسلام کے اندر جزیہ کا تصور کوئی جابرانہ وظالمانہ ٹیکس نہیں ہے جس طریقہ سے دنیاوی و مادی فاتحین کمزوروں اور مغلوبوں کا استحصال کیا کرتے ہیں بلکہ وہ بہت مناسب اور کم جزیہ کی قیمت طے کرتا ہے اور اس کی تقسیم تین طرح سے کی گئی ہے۔

(۱) جن لوگوں کا معیار زندگی بلند ہے اور خوشحال زندگی گزارنے والے ہیں ان سے سالانہ ۴۸ درہم وصول کیے جائیں گے۔

(۲) اور جن لوگوں کا تعلق متوسط ومعتدل خاندان سے ہے یا متوسط درجہ کے تاجر یا کاشتکار ہیں ان سے ان کی حیثیت کے مطابق ۲۴ درہم سالانہ وصول کئے جائیں گے۔

(۳) اور تیسرے درجہ کے وہ لوگ ہیں جو مزدور پیشہ طبقہ ہے یا جن کا معیار زندگی بہت پست ہے، ان سے سالانہ ۱۲ درہم وصول کیے جائیں گے، کل ملا کر یہ وہ معمولی مقدار ہے جو ایک صاحب نصاب شخص اپنے مال کی تطہیر کے لیے جو زکوٰۃ کی رقم نکالتا ہے اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے، فرض کر لیجئے اگر ایک مالدار مسلمان کے پاس ایک ملین (دس لاکھ) ہیں تو سو درہم میں ڈھائی درہم کے حساب سے اس پر سالانہ پچیس ہزار درہم زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اور یہ زکوٰۃ کی فرضیت کی جو شرعی مقدار ہے اس کے حساب سے ہوگا، لیکن اگر اس مسلمان کا ایک عیسائی یا کسی دوسرے مذہب سے تعلق رکھنے والا پڑوسی بھی دس لاکھ درہم کا مالک ہے تو اسے سالانہ صرف ۴۸ درہم ہی بطور جزیہ ادا کرنا ہوگا، اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ ایک جزیہ دینے والا شخص بطور جزیہ حکومت کو جتنا مال دے گا مسلمان کا اس سے کئی گنا زیادہ ہوجائے گا، یہ علامت ہے اس بات کی کہ اسلام مغلوب اقوام کے ساتھ استحصال کا معاملہ ہرگز نہیں کرتا ہے، اسلامی نظام میں جن لوگوں کے اوپر جزیہ نافذ کیا جاتا ہے ان کے تعلق سے یہ بات

بھی قابل توجہ ہے کہ فقیروں، بچوں، عورتوں اور عبادت وریاضت میں منہمک راہبوں نابیناؤں، بیماروں اور بے روزگاروں سے جزیہ ساقط کردیا جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال عہد اسلامی کے نامور سپوت وسپہ سالار حضرت خالد بن ولیدؓ کی ہے، اوران کا وہ معاہدہ ہے، جوانھوں نے ''ناطف'' نامی پادری کے ساتھ کیا تھا، جس کے الفاظ یہ ہیں، ''میں نے آپ لوگوں سے معاہدہ کیا ہے کہ ہرکمانے والے شخص سے جزیہ لیا جائے گا، اور پھر سب لوگوں کے جان ومال کی حفاظت کی ذمہ داری مملکت اسلامی پر ہوگی، اور یہ جزیہ ہرشخص سے اس کی حیثیت کے مطابق لیا جائے گا، مالدار سے اس کی حیثیت کے مطابق اور تنگدست محتاج سے اس کی حیثیت کے مطابق معاملہ کیا جائے گا، اوراسی پر بس نہیں بلکہ اسلام نے جزیہ دینے والے تمام لوگوں کو عسکری وفوجی اعتبار سے ان پر جنگ میں شرکت کا دباؤ نہیں ڈالا، اور یہ بات عدل کے خلاف بھی تھی کہ جولوگ مبادیات واساسیات اسلام سے متفق نہ ہوں، اس کو نہ مانتے ہوں، ان کے نوجوانوں کو اس کی راہ میں خون بہانے کے لیے آگے بڑھایا جائے، اسی لیے ان کو عسکری وفوجی خدمات کوانجام دینے کے تعلق سے بالکل مستثنیٰ کردیا گیا تھا لیکن اس کے بعد اوراس اصول کے بعد اگر کوئی ذمی شخصی رضا کارانہ طور پر لشکر اسلامی میں شمولیت چاہتا ہے تو اس کو شامل کرلیا جائے گا اوراس کے عوض اس سے جزیہ ساقط ہوجائے گا، اس طرح آج کے اس دور حاضر میں جزیہ کی حیثیت دراصل فوجی خدمت سے رخصت کا معاوضہ ہے۔

اسلام سے پہلے غالب اقوام مفتوح اقوام کا کوئی حق تسلیم نہیں کرتی تھیں، بلکہ ناقابل برداشت ان سے جزیہ اور ٹیکس وصول کیا جاتا تھا، چاہے وہ دینے کی حالت میں ہو یا مفلسی نے اس کو جکڑ رکھا ہو، اوران کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا تھا، اس کے برعکس اسلام نے سارے ذمیوں کے لیے خواہ وہ جزیہ دیتے ہوں یا بے روزگاری کے سبب جزیہ دینے کی سکت نہ رکھتے ہوں، اسلام نے ان کے لئے اجتماعی ضمانت کا اعلان کیا ہے اور اس بات کی بھی تاکید کی ہے کہ ذمیوں کے ساتھ عزت واکرام کا معاملہ کیا جائے تاکہ انھیں اپنی اس حالت کا احساس نہ ہو اور خالد بن ولید نے اہل ''حمص'' کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا، اس میں یہ بات موجود ہے کہ جولوگ کام سے معطل ہوگئے عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے یا جن پر کوئی مصیبت آن پڑی یا جو دولت مند تھے اب وہ قلاش ہوگئے اوران کے ہم مذہب لوگ انھیں صدقہ وغیرہ دینے لگے تو ایسے تمام لوگوں سے جزیہ نہیں وصول کیا جائے گا، اوران کی اوران کے اہل وعیال کی مالی کفالت بیت المال سے کی جائے گی۔

مفتوح اقوام کے لیے جزیہ کا نفاذ ذلت ورسوائی کے مرادف ہرگز نہیں ہے، کیونکہ بہت ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ بات پیدا ہو کہ قرآنی آیت جو جزیہ سے متعلق ہے اس میں ''صاغرون'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور صاغرون کے لغوی معنی بے بسی، کسی کے سامنے جھکنا، ہتھیار ڈال دینا ہیں، قرآنی آیت ہے "حتی یعطوا الجزیة عن یدوھم صاغرون" تو یہ بات ملحوظ رہے کہ لفظ ''صغار'' کے اندر جو کہ عربی زبان کا لفظ ہے اس کے مفہوم میں بات ماننے کے بھی معنی ہیں، اوراس کے لیے خوب مستعمل بھی ہے، اسی کی ایک بڑی مثال ''طفل'' ہے۔ یہ بھی عربی زبان کا لفظ ہے اس کے لیے ہم ''صغیر'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں جو ''صغار'' ہی سے مشتق ہے کیونکہ ''صغر'' کے مفہوم میں تابعداری ہے، بچہ کو صغیر اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ اپنے والدین یا اپنے سے بڑے افراد کی بات مانتا ہے، اوران کی اطاعت کرتا ہے تو یہاں بھی صغار سے مراد ارباب سلطنت کی بات کو ماننا اور اطاعت کرنا ہے، اور قرآن کریم کے اندر کوئی ایسی آیت نہیں ہے جس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہو کہ جزیہ کا مقصد زبردستی یا جبر واکراہ کے ساتھ اسلام میں داخل کرانا ہو بلکہ قرآن کا اعلان ہے لا إکراہ فی الدین دین اسلام میں کوئی زوروزبردستی نہیں ہے، اس کی تعلیمات، ہدایات واضح اور روشن میں، جو اتباع کرے گا وہ

کامیاب ہوگا، ورنہ نامراد ہوگا۔

بہت تفصیلی وضاحت کے ساتھ قرآن نے یہ بھی بیان کردیا ہے کہ مسلموں کو غیر مسلموں کے ساتھ کیسے رہنا چاہیے، ان کا سلوک ان کے لیے کیسا ہو؟ کس درجہ کا ہو، ارشاد ربانی ہے: "لا ینهاکم الله عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروهم و تقسطوا إلیهم، ان الله یحب المقسطین، إنما ینهاکم الله عن الذین قاتلوکم فی الدین وأخرجوکم من دیارکم و ظاهروا علیٰ إخراجکم أن تولوهم، و من یتولهم فاولئك هم الظٰلمون۔"

ترجمہ: اللہ تمہیں ایسے لوگوں سے نہیں روکتا جنھوں نے تم سے دین کے سلسلہ میں قتال نہیں کیا اور نہ تمہیں اپنے گھروں سے نکالا کہ تم ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور انصاف سے کام لو، یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے، وہ تو تمہیں ان لوگوں سے دوستی کرنے سے روکتا ہے، جنھوں نے دین کے بارے میں تم سے جنگ کی اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالے جانے پر انھوں نے مدد کی اور جو بھی ان سے دوستی رچائے گا تو ایسے لوگ بڑے ناانصاف ہیں۔

یعنی جو غیر مسلم مسلمانوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے ہیں ان سے اچھا برتاؤ کرنا چاہیے، اللہ اس سے نہیں روکتا، لیکن جو کھلم کھلا دشمن ہیں، ان سے احتیاط ہی لازم ہے، اور قرآن کریم کی وہ آیات جو نزول ترتیب کے اعتبار سے آخری ہیں، ان میں صراحتاً بیان کردیا گیا ہے اور تحدید کردی گئی ہے کہ مسلموں و غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کس حد تک مباح ہیں، ارشاد خداوندی ہے: "الیوم احل لکم الطیبت وطعام الذین اوتو الکتاب حل لکم وطعامکم حل لهم، والمحصنٰت من المؤمنات والمحصنٰت من الذین اوتو الکتٰب من قبلکم إذا اتیتموهن اجورهم محصنین غیر مسافحین ولا متخذی أخدان، ومن یکفر بالإیمان فقد حبط عمله وهو فی الآخرة من الخٰسرین"۔

ترجمہ: آج تمہارے لئے تمام پاک چیزیں حلال کردی گئیں اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے جائز ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے جائز ہے، اور اسی طرح ایمان والی پاکدامن عورتیں اور ان لوگوں کی پاکدامن عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب مل چکی ہے تمہارے لیے جائز ہیں جب تم ان کو نکاح کی پاکی میں لیتے ہوئے ان کا مہر دے دو، مستی نکالتے ہوئے نہیں اور نہ چوری چھپے آشنائی کرتے ہوئے۔ اور جو کوئی ایمان سے انکار کرے گا تو اس کا سب کیا دھرا غارت ہوا اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں ہے"۔ یعنی اہل کتاب کے ساتھ دو خصوصیتیں برتی گئیں: ایک ان کے ذبیحہ کو حلال رکھا گیا، دوسرے ان کی عورتوں سے نکاح جائز رکھا گیا لیکن موجودہ یہودی اور عیسائی چونکہ بالکل اپنے دین سے ہٹ گئے ہیں اس لیے احتیاط ہی بہتر ہے۔ خاص طور پر ان کے یہاں شادی ایمان کے لیے خطرہ بن سکتی ہے، اس لیے اس سے بچنے کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی وضاحت ملحوظ رہے کہ خاندانی نظام وجود میں لانا مقصود ہو، شہوت رانی پیش نظر نہ ہو۔

لہٰذا اس مکمل بحث سے یہ بات نکل کر سامنے آئی کہ مسلموں کے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات سراپا عدل و انصاف اور صلاح اور باہم تعاون و رشتہ داری پر قائم ہیں ہونے چاہیے، اور ان سے اختلاف دین یا کسی بھی قسم کا کوئی بھید بھاؤ نہ رکھا جائے بلکہ ان تمام نقطہائے نظر کو ختم کر کے مساویانہ حقوق قائم کیے جائیں، اور ہر وہ صورت اختیار کی جائے جو معاشرہ تعمیر کا سبب ہو۔ (الرسول القائد)

☆☆☆

❑ سفرنامہ

حیدرآباد، گلبرگہ و بیدر کا ایک یادگار تعلیمی سفر

ڈاکٹر عبید اقبال عاصم
9358318995

آل انڈیا ایجوکیشنل موومنٹ (AIEM) دہلی، نے مسلم ایجوکیشنل سوشل اینڈ کلچرل آرگنائزیشن (MESCO) حیدرآباد، کے تعاون واشتراک سے مورخہ ۱۳/تا ۱۶/جون ۲۰۱۹ء حیدرآباد میں چار روزہ تعلیمی کانفرنس کا انعقاد کیا، جس کا مرکزی عنوان ''انڈیا ایجوکیشن کنکلیو 2019'' (India Education Conclave 2019) تجویز ہوا اور جس کا محور کوالٹی ایجوکیشن، چیلنجز اینڈ پراسپیکٹس'' (Quality Education Chellanges & Prospectus طے ہوا۔ اس کا ایجنڈا ڈراپ آؤٹس، اسکل ڈولپمنٹ، کوچنگ کلاسز، سائبر سیکوریٹی، قرآن فہمی، عربک لینگویج، سیرت النبی، اسلامک تاریخ اور اس کی خدمات نیز جدید ترین تعلیمی اداروں وغیرہ کی صورت حال پر جائزہ و تجزیہ کو پیش نظر رکھ کر ترتیب دیا گیا جس میں ملک بھر کے منتخب تعلیمی ماہرین کے خطابات و بیشتر تحقیقی مقالات کو جدید ترین ٹیکنالوجی یعنی پاور پریزینٹیشن کے ذریعہ پیش کیا گیا۔

حیدرآباد میں منعقدہ اس چار روزہ تعلیمی کانفرنس سے بہت سی باتیں سیکھنے کو ملیں جن میں بعض حوصلہ افزا بھی تھیں اور بہت سی تعجب خیز بھی۔ ۱۳/جون کے کسی بھی اجلاس میں شرکت دہلی سے حیدرآباد جانے والوں کے لیے ممکن نہیں ہوسکی کیونکہ دہلی سے فلائٹ قدرے تاخیر سے چل کر شام ۷/بجے حیدرآباد ائیر پورٹ پر پہنچی۔ اس کے موضوعات ڈراپ آؤٹس، تلنگانہ اقلیتی رہائشی تعلیمی مراکز سوسائٹی، اسکل ڈیولپمنٹ، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ اور کوچنگ کلاسز کے تعلق سے مفید و مؤثر گفتگو کرنا تھی۔ یہ پروگرام مدینہ ایجوکیشنل سوسائٹی نام پلّی علاقے میں منعقد ہوا۔ البتہ ۱۴/تا ۱۶/جون کے مختلف العناوین اجلاس میں شرکت ہوئی، جس سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ ۱۴/جون کی صبح کا سیشن سالار جنگ میوزیم کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت حکومت تلنگانہ کے اقلیتی امور کے خصوصی مشیر کار و سابق آئی پی ایس افسر محترم اے کے خان (عبدالقیوم خاں صاحب) نے فرمائی جبکہ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے حیدرآباد میں واقع ترکی سفارت خانے کے کونسلر صاحب نے شرکت فرمائی۔ نظامت کے فرائض میسکو کے سیکریٹری محترم ڈاکٹر محمد فخر الدین صاحب نے انجام دیئے۔ مسلمانوں کی تعلیم کے تعلق سے پروفیسر محمد اختر صدیقی صاحب (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) اور محترم پروفیسر خواجہ محمد شاہد صاحب (صدر اے آئی ای ایم) و سابق پرووائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد نے اپنے تحقیقی مقالات پیش کئے۔ دونوں حضرات نے ہندوستان کی موجودہ تعلیمی صورت حال اور مسلمانوں کے ستر سالہ تعلیمی سفر پر اعداد و شمار کی روشنی میں تخمینے بھی پیش کئے۔ حالات کا جائزہ بھی لیا اور تجزیاتی مطالعہ

بھی سامنے رکھا۔ علاوہ ازیں دیگر مقررین نے بھی مرکزی موضوع کے حوالے سے اپنی گفتگو پیش کی، یہ سیشن اپنی معلومات، مطالعات، جائزوں، تجزیوں اور تجربوں کے حوالے سے بیش قیمت سیشن تھا، جس میں جنوبی و شمالی ہند کی تعلیمی صورتحال کا موازنہ بھی بیشتر مقررین نے کیا۔ جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال ہر ایک کے لئے حوصلہ افزا رہی تو شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی بھی اعداد وشمار کی روشنی میں سامنے آئی۔ یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس خطہ کے مسلمانوں نے کم وبیش پچاس سالہ تعلیمی غفلت کے جرم عظیم کا مرتکب ہونے کی پاداش میں اپنے کو پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ البتہ ماضی قریب میں مسلمانوں کی طرف سے تعلیم کے فروغ کے لئے جو کوششیں کی جارہی ہیں ان سے یہ امید کی جانی چاہیے کہ ان شاءاللہ مستقبل قریب میں تعلیمی پسماندگی کی صورت حال تبدیل ہوگی۔

نمازِ جمعہ وطعام کے بعد مسلم خواتین کی تعلیمی، سماجی، طبی وتہذیبی صورتِ حال پر میسکو کنونشن سینٹر، ملک پیٹ میں ایک خصوصی سیشن منعقد ہوا جس میں مختلف خواتین مقررین نے اپنے مقالات پیش فرمائے۔ انگریزی زبان میں پیش کئے گئے ان مقالات کی خصوصیت یہ تھی کہ نہ تو کوئی تکرار تھی اور نہ ہی منتجہ موضوع سے ہٹ کر کسی مقرر نے کوئی بات کہی۔ محترمہ پروفیسر اثنا عروج صاحبہ، پروفیسر رخشیدہ سید صاحبہ، محترمہ فخر النساء صاحبہ اور دیگر تجزیہ نگار خواتین نے بہت ہی بہتر انداز سے درج بالا موضوعات کا جائزہ لے کر اس سمت میں چھائی ہوئی بے بسی دور کرنے اور مسلم خواتین کو بیدار کرنے کا مشورہ بھی دیا اور موجودہ صورتِ حال پر اپنی تشویش کا اظہار بھی کیا۔

۱۵/ جون کی صبح کا پروگرام بنجارہ ہلز میں واقع سلطان العلوم ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام چلنے والے مخدوم جاہ انجینئرنگ کالج کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ جس میں تعلیم کے روزمرہ بدلتے طریق کار اور جدید ذرائع تعلیم پر مخدوم جاہ انجینئرنگ کالج کے اساتذہ نے تعارفی گفتگو فرمائی، ڈاکٹر احمد عبدالحئی صاحب (پٹنہ) انجینئر طارق اعظم صاحب ملیشیا، امریکی سفارت خانہ حیدرآباد کے کونسلر محترم ایلی الیکزینڈر کے خصوصی خطابات ہوئے۔ مذکورہ خطابات کے بعد چائے کا وقفہ ہوا جس میں اس کالج کے طلباء نے اپنی سائنسی ایجادات کا حاضرین اجلاس کو مشاہدہ کرایا، اس کے بعد لنچ تک اور پھر لنچ کے بعد شام چھ بجے تک تسلسل کے ساتھ تین اجلاس پر مشتمل اس پورے دن کو ٹیکنالوجی ریسرچ اینڈ انڈسٹری، مصنوعی ذہانت، سائبر سیکوریٹی، سائنس، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ اینڈ میتھا میٹکس (STEM) کے ذیلی عناوین کے ساتھ مختص کیا گیا تھا۔ جن پر پورے دن سیر حاصل بحث بھی ہوئی۔ اعتراضات وجوابات بھی ہوئے اور تحقیقات وانکشافات سے بھی حاضرین اجلاس متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکے۔

بعد نمازِ مغرب قدیم حیدرآباد کے مشہور علاقے ٹولی چوکی میں واقع اذان انٹرنیشنل اسکول میں طلباء کی حوصلہ افزائی کا پروگرام منعقد ہوا جس میں بطورِ خاص خواجہ محمد شاہد صاحب، محترم امان اللہ خاں صاحب، ڈاکٹر جاوید جمیل صاحب اور ڈاکٹر محمد فخر الدین صاحب نے بطورِ خاص اسکول کے ان طلباء کو انعامات واعزازات سے نوازا جنھوں نے رواں سال میں بہتر تعلیمی کارکردگی کا مظاہرہ کیا، اسکول کے روحِ رواں ڈاکٹر محمد یوسف اعظم صاحب نے اسکول کے مقصدِ قیام اور ارتقائی منازل کی تفصیلات پیش فرمائیں، اس کا اختتام عشائیہ پر ہوا۔

۱۶/ جون کی صبح میسکو کنونشن سینٹر ملک پیٹ حیدرآباد میں دینی مدارس کی موجودہ تعلیمی صورت حال اور بدلتے حالات کے تقاضوں کے مطابق اس کے نصاب ونظام میں تبدیلی کی راہیں تلاش کرنے کے لئے مختص تھا جو مشہور عالمِ

دین محترم مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں محترم پروفیسر فہیم اختر ندوی صاحب، حیدر آباد میں مقیم انگلینڈ کے سفارت کار ڈاکٹر جاوید جمیل صاحب، محترم ڈاکٹر عمری صاحب اور ایک خاتون مقرر نے اپنے خطابات کی روشنی میں مدارس کی صورتِ حال، طریق کار، قرآن و دینیات کے نصاب، انتظامی طریق کار کی خوبیوں و خامیوں پر سیر حاصل گفتگو فرمائی۔ دوسرا سیشن تسلسل کے ساتھ پروفیسر فہیم اختر ندوی صاحب کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر مولانا عمر العابدین رحمانی صاحب، پروفیسر جہانگیر عالم صاحب اور دوسرے بہت سے حضرات نے اظہارِ خیال فرمایا، اس اجلاس میں بطورِ خاص مولانا محمد ولی رحمانی صاحب جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے شرکت فرمائی۔ نماز وطعام کے بعد اجلاس کو حیدر آباد میں چلنے والے خواتین کے مختلف دینی مذہبی تعلیمی اداروں سے متعلق مخصوص رکھا گیا۔ اس اجلاس میں اساتذہ نے اپنے ہوشیار طلباء و طالبات کے پرکشش پروگرام پیش کئے۔ علوم دینیہ کے ابتدائی وثانوی درجات، طالبات کے ذریعہ عربی قواعد، ادب، قرآن و سیرت پر عبور کے نمونے پیش کئے گئے۔ اس پروگرام کی سربراہی عربک لینگویج اینڈ انگلش ایجوکیشن فاؤنڈیشن (ALEFF) نامی ادارے کے منتظمین نے کی۔ اس کے ساتھ ساتھ برابر والے ہال میں آل انڈیا ایجوکیشنل موومنٹ کی نویں سالانہ میٹنگ کا انعقاد بھی عمل میں آیا۔

کانفرنس کا آخری اجلاس محترم ڈاکٹر فخر الدین صاحب کی زیر صدارت شام ۵/ بجے منعقد ہوا، جس کا آغاز راقم (عبید اقبال عاصم) کی تلاوتِ کلام اللہ سے ہوا۔ محترم عبدالرشید صاحب ایڈیشنل جنرل سکریٹری (AIEM) نے نظامت کے فرائض انجام دیے، صدارت محترم ڈاکٹر محمد فخر الدین صاحب نے فرمائی۔ ڈاکٹر ابرار اصلاحی صاحب اور پروفیسر محمد یوسف اعظم صاحب کے خصوصی خطابات ہوئے۔ جناب سید مظفر علی صاحب جنرل سکریٹری آل انڈیا ایجوکیشنل موومنٹ نے تجاویز پیش کیں جنہیں تمام حاضرین نے متفقہ رائے سے پاس کیا۔

بعد نمازِ مغرب نیو ملک پیٹ میں شاہین گروپ کی حیدرآباد شاخ کا انعقاد عمل میں آیا جس میں تمام اراکین کارواں نے شرکت کی، اس تقریب میں ملک پیٹ کے ایم ایل اے پاشا صاحب بھی تشریف لائے۔ موصوف کے علاوہ مفتی عمر العابدین رحمانی صاحب اور ڈائرکٹر شاہین گروپ ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب کے خصوصی خطاب کے ساتھ یہ مختصر سی تقریب دعاء پر اختتام پذیر ہوئی۔

۱۷/ جون کی صبح شمالی ہندوستان کے شرکائے کانفرنس نے حسبِ پروگرام گلبرگہ کے لئے رختِ سفر باندھا۔ یہاں پر جنوبی ہند کے معروف صاحب سلسلہ بزرگ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی درگاہ واقع ہے۔ کم وبیش ساٹھ سال قبل اس درگاہ کے سجادہ نشین خواجہ محمد حسینی صاحب کے دل میں تعلیم کا چراغ روشن کرنے کی رمق پیدا ہوئی جسے انھوں نے اخلاص و محبت کے ساتھ تن تنہا یہ سوچ کر جلایا کہ ؎

شکوۂ ظلمت شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

اللہ نے ان کے اس کام کو قبول فرمایا اور اس میں خوب برکت عطا فرمائی۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے نام اور ان کی درگاہ سے منسوب دینوی تعلیمی ادارے وجود میں آنے کے بعد آج ان اداروں نے خود مختار حیثیت سے خواجہ بندہ نواز یونیورسٹی (K.B.N) کی شکل اختیار کرلی ہے جس سے جنوبی ہی نہیں شمالی ہندوستان کے بھی ہزار ہا طلبا مستفیض ہو رہے ہیں۔ وفد نے درگاہ میں عقیدت واحترام کا نذرانہ بھی پیش کیا اور ان اداروں بطورِ خاص K.B.N یونیورسٹی کا معائنہ بھی کیا۔

ادارے کے وائس چانسلر محترم پٹھان صاحب جو اس سے قبل مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے بھی وائس چانسلر رہ چکے ہیں، ان سے خصوصی ملاقات بھی ہوئی، یہاں آکر وقت کی تنگدامنی کا احساس ضرور رہا۔ دریں اثناء اس شہر میں واقع غریب بچیوں کے یتیم خانہ ''زہرہ اسکول'' کی عمارت اور اساتذہ وانتظامیہ سے ملاقات نے بھی مسرور کیا، یہیں پر بے تکلف ظہرانہ کا انتظام تھا جو اپنی سادگی میں حسن کی آمیزش لئے ہوئے تھا۔ ان سب امور سے فارغ ہوکر شام میں بیدر شہر کے لئے رختِ سفر باندھا جہاں شاہین گروپ کے ڈائریکٹر محترم عبدالقدیر صاحب نے عشائیہ کے ساتھ ساتھ مہمانوں کے قیام کا بھی انتہائی آرام دہ انتظام کر رکھا تھا۔

شاہین گروپ کے وسیع وعریض چھ منزلہ رہائشی کیمپس کے انتہائی کشادہ صحن میں رات کے پرتکلف کھانے کا ذائقہ دوچند ہو رہا تھا، کافی رات گذرنے کے بعد اپنی اپنی قیام گاہوں پر واپسی ہوئی، صبح میں بیدر شہر کے وسط میں واقع اس پرشکوہ خستہ قدیم مسجد اور اس کے اطراف میں آثارِ قدیمہ کی تحویل میں لئے گئے شکستہ قلعہ کو باہر سے ہی دیکھنے کا اتفاق ہوا جو تقریباً پانچ سو سال قبل اس وقت کے دکنی حکمراں کی ایماء پر وجود میں آیا تھا کیونکہ اس کے کھلنے کا سرکاری وقت نو بجے کے بعد کا مقرر تھا اور اراکین کارواں کے پاس وقت کی تنگی تھی لیکن اس کی تلافی بایں طور کی گئی کہ اسی عمارت کے بالمقابل گلی میں واقع عبدالقدیر صاحب کے ذریعہ تعمیر کئے گئے مضبوط علمی قلعہ کو دیکھا جائے۔ قدیم شکستہ عمارت سے متصل شاہین گروپ کے اس جدید کیمپس کو دیکھ کر انتہائی مسرت حاصل ہوئی جو نیٹ کی طالبات کے لئے مخصوص ہے۔ اس کیمپس میں ہزار ہا طالبات ہیں جن کا مقصد نیٹ امتحان کو الیفائی کر کے اپنا مستقبل روشن کرنا ہے، اس میں مذہب وذات کی کوئی تخصیص نہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ طالبات کی شناخت ان کے مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ بلیک اینڈ وہائٹ (مسلم طالبات) اور ملٹی کلر (غیر مسلم طالبات) کے لئے مختص ہے کیونکہ مسلم طالبات برقعہ اور حجاب میں ہوتی ہیں اس لئے انھیں بلیک اینڈ وہائٹ کلر دیا گیا ہے۔ دوسری غیر مسلم طالبات اس سے مستثنیٰ ہیں اس لئے انھیں ملٹی کلر سے تعبیر کیا گیا ہے، ان طالبات کے ساتھ تھوڑا وقت گذار کر یہ احساس ہوا کہ ان میں عزم وحوصلہ کے ساتھ مستقبل کی امیدیں روشن ہیں، ان کی آنکھوں میں پائی جانے والی چمک اس یقین کو اجاگر کر رہی تھی کہ وہ آنے والے سال میں NEET کو الیفائی کر کے اپنی منزل کا تعین کرنے میں کامیاب ہوجائیں گی۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد قدرے فاصلے پر واقع شاہین گروپ آف انسٹی ٹیوٹس کے دوسرے کیمپس میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں ہزار ہا طالبات وفد کی منتظر تھیں۔ بہرحال ان اداروں کو دیکھ کر عبدالقدیر صاحب کی نیک نیتی اور اخلاص میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی۔ بیس سال قبل دس بارہ بچوں کو لے کر معمولی کرایہ کے ایک کمرے میں جس ادارے کی تخم ریزی کی گئی تھی دو دہائیوں کے بعد وہ ادارہ اس قدر تناور درخت بن جائے گا، اس کا تصور قیام کے وقت ناممکن تھا، لیکن الحمدللہ عبدالقدیر صاحب کی پرخلوص محنت وجدوجہد اور اللہ کے خاص فضل وکرم نے اس کو حقیقت میں تبدیل کر دیا ہے۔ پروین شاکر نے ایسے ہی موقع کے لئے کہا ہے کہ ؎

دل میں یقین صبح کی لو جو ذرا بلند ہو
کافی ہے ایک ہی دیا شب کی سیاہ کے لئے

بہرحال عبدالقدیر صاحب کی کوششوں، کاوشوں اور عزم وجہد مسلسل کو اراکین کارواں نے عظمت بھرا سلام پیش کیا اور شاہین کیمپس کے اصل پروگرام کے لئے رواں دواں ہوگئے۔

بیدر شہر کے کنارے پر نو تعمیر شدہ شاہین گروپ کے

کیمپس کے انتظامات بھی قابل دید اور لائق تحسین ہیں، سینکڑوں بیگھے پر مشتمل اس کیمپس کی چھ منزلہ کچھ تعمیر شدہ اور کچھ زیر تعمیر بلند و بالا وسیع وعریض عمارات کے اندر بہ یک وقت کم وبیش چھ ہزار طلباء کی رہائش وطعام کا انتظام ہے، اس کے کنٹرول روم کو دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں 450 کیمروں کی کمانڈ ہے۔ کیمپس کے ہر ہر کونے، کمروں، طعام گاہ، آمد و رفت کے راستوں، دور دراز واقع شاہین کیمپس سبھی پر کیمروں کی نظر ہے تاکہ کوئی بدنظمی نہ ہو سکے۔

شاہین کیمپس کے پروگرام میں بطورِ خاص اعظم ایجوکیشنل سوسائٹی کے ان غریب معصوم بچوں بچیوں کی شرکت سبھی کی توجہ کا باعث رہی جو عمر کی ساتویں منزل سے لے کر بارہویں سال میں داخل ہونے تک اعظم ایجوکیشنل سوسائٹی پونا میں اپنی صلاحیتوں کی بنا پر تعلیمی ارتقائی سفر طے کر رہے ہیں، ان نادار معصوم بچوں وبچیوں نے حاضرین کے سامنے ہارڈ ویئر کمپیوٹر کی اصطلاحات پر عبور ہونے کا یقین دلایا۔ تمام سائنسی وٹکنالوجیکل سوالات کے تشفی بخش جوابات سن کر سامعین نے پونا سے آئے ہوئے ان طلباء کی حوصلہ افزائی کی اور وہاں کے منتظم اعلیٰ مشہور ماہر تعلیم جناب پی اے انعامدار صاحب کی ستائش کی، اس کے بعد پروگرام کا آغاز ہوا جس کی صدارت محترم پی اے انعامدار صاحب نے فرمائی۔ پروفیسر اسلم پرویز صاحب شیخ الجامعہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔ بہت سے مقررین نے خطابات سے نوازا۔ بعد دوپہر پروگرام اختتام کو پہنچا اور شرکاء اپنی اپنی راہوں پر چلے گئے۔ ہم لوگوں کو حیدرآباد سے اگلی صبح (19/ جون) کو ٹرین لینی تھی اس لئے ہم نے حیدرآباد کے لئے رختِ سفر باندھ لیا اور پھر حسب پروگرام 19/ جون کو حیدرآباد سے چل کر 20/ جون کی صبح علی گڑھ پہنچ گئے۔

یہ اس پانچ روزہ تعلیمی صورت حال کی مختصر ترین روداد ہے جو ۱۴/ تا ۱۸/ جون جنوبی ہند کے مختلف مقامات پر مشاہدے میں آئی اس کا موازنہ اگر ہم شمالی ہندوستان میں واقع مسلم منتظمہ عصری تعلیم گاہوں سے کریں تو دونوں میں نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ شمالی ہندوستان میں تعلیم کی دو راہیں دینی و دنیوی راہوں میں تفریق کی صورت میں نظر آتی ہیں جن میں ارتباط کی کوئی شکل نہیں پائی جاتی جبکہ جنوبی ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں یہ کوشش نمایاں نظر آتی ہے کہ وہ دونوں کے درمیان پائی جانے والی خلیج کو کم سے کم تر کرنے میں مصروف ہیں۔

دوسری خاص بات یہ ہے کہ جنوبی ہندوستان میں تعلیمی میدان میں منہمک افراد منظّم طریقے پر کام کر رہے ہیں جبکہ شمالی ہند میں یہ کام اتنے زیادہ نظم وضبط کے ساتھ نہیں ہو پا رہا ہے۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اجتماعیت کا جو مظاہرہ جنوبی ہند کے اداروں میں دیکھنے کو ملا اس کی جڑیں شمالی ہند میں کمزور نظر آتی ہیں۔ ایک اور بات یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ شمالی ہندوستان میں ہم کاموں کے بوجھ کو زیادہ محسوس کرتے ہیں جبکہ جنوبی ہندوستان کے افراد بڑے کاموں کو روزمرہ کے معمول کے مطابق لینے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کنکلیو کے منتظم اعلیٰ ڈاکٹر محمد فخر الدین صاحب کے یہاں اسی درمیان شادی تقریبات بھی انھی علمی اجلاس کے متوازی چلتی رہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نہ تو کنکلیو کے پروگرام میں کوئی کٹوتی کی اور نہ ہی شادی کی تقریبات سے اجتناب برتا۔ ۱۳/ تاریخ کی رات کو رسم مہندی میں ڈاکٹر صاحب نے تمام مہمانوں کا استقبال اور ان کی ضیافت بھرپور انداز سے کی۔ ۱۴/ کو صبح تا شام تمام پروگراموں میں ایک نئے حوصلے کے ساتھ شامل رہے۔ رات کو بیٹی کی بارات آئی تو باراتیوں اور اپنے تمام مہمانوں کا ہشاش بشاش مسکراتے چہرے کے ساتھ پرتپاک استقبال کیا

اور چہرے مہرے سے نہ تو کانفرنس کی تکان کا احساس ہونے دیا اور نہ ہی مہمانوں کے خیر مقدم میں کسی بخل سے کام لیا۔ ۱۵/ جون کی صبح سے نئی امیدوں کے ساتھ پھر تعلیمی کانفرنس کو کامیاب بنانے میں مصروف رہے۔ ۱۶/ جون کو بھی صبح تا اختتام پروگرام میں اپنی حاضری اور مسلسل موجودگی کو یقینی بنایا اور پھر ۱۶/ کی رات کو اسی بیٹی کے ولیمہ کی تقریب میں بھی تمام مہمانوں کو عزت و وقار کے ساتھ مدعو کیا، ان کی پذیرائی کی اور نہایت سادہ انداز میں شریک محفل رہے۔

حیدرآباد کی شادی تقریبات بھی مثالی رہیں۔ شمالی ہندوستان میں رائج مغربی تہذیب ''الطعام کالانعام'' کے برعکس وہاں پر مدعوئین کی ضیافت نہایت شائستگی، تہذیب و سلیقہ سے کی گئی۔ رسومات کی اگرچہ حوصلہ افزائی نہیں کی جاسکتی اور اس سے عام مہمان بے خبر بھی رہے البتہ ڈاکٹر صاحب موصوف کا تعلیمی کانفرنس و شادی میں شریک مہمانوں کے سامنے بچھ جانا اور عاجزانہ و منکسرانہ انداز سے مہمانوں کے ساتھ پیش آنا۔ عزت و وقار کے ساتھ کھانا کھلانا ایسی یادگار چیزیں ہیں جنھوں نے تمام شرکاء کے ذہنوں پر مثبت نقوش مرتب کئے۔ کھانے میں فالتو قسم کے اضافوں سے ڈشز کی تعداد بڑھانے کا دستور نہیں بلکہ کھانے کے موقع پر کھائی جانے والی منتخب چیزیں بہت ہی پرتپاک طریقے سے پیش کی گئیں جن سے مہمانوں نے لطف اٹھایا۔ ایک اور قابل تعریف بات یہ رہی کہ ان تقریبات میں مردوں و عورتوں کے جداگانہ انتظامات اتنے بہتر طریقے سے کئے گئے تھے کہ مردان خانے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جارہا تھا کہ اس تقریب میں خواتین بھی شریک محفل ہیں۔ معلوم ہوا کہ تقریبات کا یہ انداز حیدرآباد میں عام ہے جو بہر طور قابل تعریف ہے۔

اراکین کارواں نے گلبرگہ میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی درگاہ پر سکون محسوس کیا تو اس سے زیادہ طمانیت اس میں حاصل ہوئی کہ درگاہ کے منتظمین نے صاحبِ درگاہ کی نسبت کو تعلیم سے جوڑ کر بلندیوں پر پہنچایا ہے جو شمالی ہندوستان کے باشندوں کے لئے لائقِ مثال ہے۔ شمالی ہندوستان میں اسی قسم کی کوشش مارہرہ شریف کی درگاہ سے وابستگان کی طرف سے ''البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی'' کے ذریعہ علی گڑھ و مارہرہ شریف میں ضرور ہوئی، جس کو ملت سراہتی ہے، کاش کہ بڑی بڑی درگاہوں سے وابستہ دوسرے ذمہ دار حضرات بھی اپنی توجہات اس طرف صرف کردیں تو ان شاء اللہ ملت کی نیا پار لگنے میں دیر نہ لگے گی۔

بیدر کے شاہین گروپ نے تمام شرکاء کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ یہاں کے طلباء و طالبات کی چمکتی آنکھوں میں روشن مستقبل کے ایسے خواب نظر آرہے تھے جو ان شاء اللہ بہت جلد تعبیر سے ہم کنار ہوں گے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اسے رول ماڈل بنا کر اسی قسم کی کوششیں شمالی ہندوستان میں بھی کی جاتیں، جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کے ذریعہ کی جانے والی یہ تعلیمی کوششیں شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔ ماضی قریب میں پائی جانے والی تعلیمی بیداری سے یہ امید کی جاتی ہے کہ ان شاء اللہ العزیز مستقبل قریب میں شمالی ہندوستان میں بھی جگہ جگہ علم کی شمعیں روشن ہوں گی، جس کی وجہ سے جہالت کے اندھیرے دور ہوں گے اور نئی نسل ملت اسلامیہ کی سرخ روئی کا سبب بنے گی۔

نہ ہو ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

☆☆☆

❑ اسباب عروج و زوال

قوموں کی تعمیر وترقی میں تعلیم کا کردار

محمد قمر الزماں ندوی
مدرسہ نورالاسلام کنڈہ پرتاپ گڑھ

انسان کے زندہ رہنے کے لئے کھانا، پانی اور ہوا یہ تینوں چیزیں ضروری اور لازمی ہیں۔ ان چیزوں کے بغیر انسان کا زندہ رہنا ناممکن ہے۔

تو جس قدر انسان کے زندہ رہنے کے لئے ان چیزوں (پانی، خوارک اور ہوا) کا ہونا ضروری ہے، اتنی ہی ضرورت انسان کے لئے تعلیم کی بھی ہے۔ علم کے بغیر انسان کی شخصیت ناقص اور نامکمل ہے، اس کے بغیر انسان صحیح زندگی نہیں گزار سکتا۔ اپنے پیدا کرنے والے اور اپنے پیدا ہونے کے مقصد کو نہیں جان سکتا۔ وہ خیر وشر اور صحیح اور غلط میں تمیز نہیں کرسکتا۔ برصغیر کے ایک بلند پایہ عالم اور مفکر کی زبان سے نکلا یہ جملہ آج بھی حافظہ میں محفوظ ہے کہ انہوں فرمایا تھا کہ دنیا کی سب سے بڑی اور بری گالی یہ ہے کہ کسی کو یہ کہہ دیا جائے کہ تم جاہل ہو۔ اس سے بڑھ کر کوئی گالی نہیں ہوسکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اور جانور کے درمیان کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ جاہل اپنے جہل کی بنیاد پر کچھ بھی کرسکتا ہے کیونکہ اس کے اندر خیر وشر اور بھلے اور برے کی کوئی تمیز ہی نہیں ہوتی ہے۔ دنیا میں اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس نے علم کو سب سے اعلی اور ارفع مقام دیا۔ اس کے دروازے کو سب کے لئے وا کیا۔ اس کے لئے جتنی رکاوٹیں ہوسکتی تھیں سب کو دور کیا اور اس کے تصور کو اتنا وسیع اور عام کیا کہ ماں کی گود سے لحد تک اس کے سفر کو وسعت دی۔

آپ غور کیجئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کس وقت اور کس ماحول میں ہوئی۔ کون سی برائی اور بدعقیدگی اور ظلم وجہالت اور سفاکی و درندگی اس سماج اور معاشرہ نہیں پائی جاتی تھی۔ اس زمانہ کو زمانۂ جاہلیت کا نام ہی دیا گیا تھا۔ بے حیائی اور بے شرمی کی انتہا یہ تھی کہ باپ کے مرنے کے بعد بڑا بیٹا ماں سے شادی کر لیتا اور سارے بھائی بہنوں کی وراثت پر قابض ہو جاتا۔ بعض خاندان اور قبیلے بیٹی کی پیدائش کو منحوس سمجھتے اور پیدا ہوتے ہی اسے زندہ درگور کر دیتے۔ کسی کو داماد بنانا وہ اپنے لئے ہتک عزت سمجھتے تھے۔ غرض ہر قسم کی برائی سے عرب معاشرہ جوجھ رہا تھا، معمولی سی بات پر برسوں ان میں لڑائیاں چلتیں۔ اس ماحول میں آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اور چالیس سال کے بعد آپ کو نبوت ورسالت ملی، اگر اس وقت کسی سلیم الفطرت انسان سے سوال کیا جاتا کہ بتاؤ، تقریباً پانچ سو سال بعد زمین کا رشتہ آسمان سے جڑا ہے اور عرب سماج کی یہ حالت ہے کہ شرک و کفر اور بداخلاقی و بے حیائی کا یہ مرکز اور اڈہ بنا ہوا ہے بتاؤ اللہ کی طرف سے پہلا پیغام اور پہلی وحی نازل ہونے والی ہے، وہ پیغام اور وحی کیا ہوگی، پہلا حکم کیا ہوگا؟ تو اس شخص کا جواب یہ ہوتا کہ اس پیغام میں کفر وشرک کی اور برائی و بے حیائی کی اور

ظلم وتشدد کی مذمت ہوگی ۔لیکن میرے بھائیو! ایسا نہیں ہوا۔ اللہ تعالی نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس موقع پر جو سب سے پہلی آیت نازل ہوئی، جو پہلا پیغام آیا، جو پہلی وحی اتری۔ وہ علم و تعلیم سے متعلق تھی:اقرأ باسم ربك الذی خلق۔ اس آیت کے اس اعجاز پر بھی غور کیجئے کہ اللہ تعالی نے اس جملہ میں فاعل اور فعل کا تذکرہ کیا لیکن مفعول کا تذکرہ نہیں کیا۔ یہ اشارہ اور دلیل ہے کہ انسان کو قرآن جو آخری الہامی اور آسمانی کتاب ہے اس کو تو پڑھنا ہی ہے اس کے علاوہ ہر اس علم کو بھی سیکھنا ضروری ہے جو انسانیت کے لئے نفع بخش ہے۔ اگر اس جگہ مفعول کا ذکر کر دیا جاتا کہ صرف قرآن پڑھو تو وحی الٰہی کے علاوہ دیگر علوم وفنون کا پڑھنا ممنوع ہو جاتا۔

اسلام نے علم کا جو آفاقی تصور دیا اور اس کی وسعت کے دائرے کو جو مہد سے لحد تک عام کیا، دنیا کے کسی مذہب نے علم کو یہ وسعت و ہمہ گیری نہیں دی۔ بلکہ اس کے برعکس علم کو کسی خاص طبقہ اور برادری تک محدود رکھا اور دوسرے کو اس کے ارادہ اور اس کی طرف نیت کرنے سے بھی روک دیا اور معلوم ہونے پر کہ فلاں برادری اور طبقہ کا بھی کوئی فرد علم حاصل کر رہا ہے، اس کو سخت سے سخت سزائیں دی گئیں۔ کیا دنیا کی کوئی قوم اور مذہب کے ماننے والے مسلمانوں سے اس موضوع پر آنکھ سے آنکھ ملا کر بات بھی کر سکتے ہیں؟

علم اسلام کا نقطۂ آغاز ہے، اسلام نے اپنے سفر کا آغاز ہی علم اور روشنی سے کیا، اسلام نے علم کو جو اہمیت دی اس کو جو مقام دیا، اس کے حصول پر جس قدر تاکید کی، مرد وعورت ہر ایک کو جس طرح اس کے حاصل کرنے کا مکلّف بنایا، وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے علم اور جہل کے درمیان خط فاصل کھینچ کر صاف لفظوں میں بتا دیا کہ اے نبی! کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟ (الزمر آیت ۹)

اسلام دنیا میں سراپا علم و آگہی بن کر آیا، اسی لئے مذہب اسلام پوری دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب کا پیامبر ثابت ہوا۔

حضرت آدم علیہ السلام کو سب سے پہلے خدائے وحدہ لاشریک نے زیور علم سے آراستہ کیا۔ اور اسی علم ومعرفت کی وجہ سے فرشتوں پر ان کو ترجیح و برتری دی۔ دوسرے مذاہب نے علم کو زندگی کی دیگر ضرورتوں کی طرح محض ایک ضرورت قرار دیا مگر اسلام نے علم کو لازمۂ حیات اور ضرورت زندگی قرار دیا۔ اسلام کے نزدیک علم صرف شعور وآگہی اور ادراک کا نام نہیں ہے بلکہ زندگی کے ان تمام تجربات اور مشاہدات کا نام ہے جو اللہ کی معرفت اور دونوں جہانوں کی سعادت کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اور انسان میں جوہر خود شناسی پیدا کرتے ہیں۔

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو قرآن مجید میں بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے تاکید کی کہ علم کی زیادتی کے لئے اپنے رب سے دعا کرو اور یوں کہو کہ رب زدنی علما۔ بارالہا! میرے علم میں اضافہ فرما۔

اور کسی چیز کی زیادتی کی دعا کے لئے نہیں کہا گیا کہ مال زیادہ دے دے۔ زر، زن، زمین زیادہ دے دے۔ عہدہ اور منصب میں خوب ترقی دے۔ صرف علم کی زیادتی اور اضافہ کے لئے دعا پر زور دیا گیا۔

پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مصنف ابن ابی شیبہ یا مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اپنے لئے سب سے نامبارک اور نامسعود دن وہ سمجھوں گا کہ پورا دن اور پوری رات گزر جائے اور میرے علم ومعرفت میں کوئی اضافہ نہ ہو سکے۔

مکہ مکرمہ میں اسلام کے آغاز کے وقت بھی آپ نے حصول علم اور تربیت کے لئے دارارقم کو اس کے لئے خاص

کیا۔ محققین اور ماہرین نے لکھا ہے کہ یہ انتخاب ایک الہامی انتخاب تھا۔ دار ارقم کا محل وقوع کچھ اس طرح تھا کہ وہ پہاڑ کے دامن میں تھا، اس کی بناوٹ اور ہیئت کچھ اس طرح کی تھی کہ اندر کے لوگ باہر کے لوگوں کی نقل وحرکت سے واقف رہتے لیکن باہر کے لوگوں کو اندر کا کچھ علم نہ ہوتا۔ اس مکان کا دروازہ بھی کچھ اسی انداز کا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آنے کو جو اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے دروازے کی اوٹ اور سوراخ سے دیکھ لیا تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی تھی۔

دار ارقم کے محل وقوع اور دعوت اسلام کے لئے اس کے انتخاب پر مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ اور جب مکہ کا لٹا پٹا قافلہ مدینہ منورہ آیا تو یہاں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت گاہ یعنی مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ کی بنیاد صفہ چبوترے کی شکل میں رکھی۔ اور یہی چھوٹی سے جگہ سارے عرب کے مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کا مرکز تھی اور خود آپ اس کے منتظم اور استاد تھے۔

اسلام میں علم کا درجہ اور مقام کیا ہے اس کا اندازہ جنگ بدر کے واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس غزوہ میں ستر اہل مکہ قتل کئے گئے اور اتنے ہی مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے۔ اس وقت مسلمان سخت مالی ومعاشی مشکلات میں گھرے تھے، لیکن اس کے باوجود بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا پہلا فدیہ یہ مقرر کیا گیا کہ جو لوگ پڑھنا لکھنا جانتے ہیں، وہ دس مسلمانوں کو پڑھنا سکھادیں۔

آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اسوہ اور عمل ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ ہمیں بھوکا رہنا پڑے تو رہ لیں۔ دنیا کے اسباب راحت کم میسر ہوں، تو ٹھیک ہے۔ ہماری کروٹیں فاقوں سے بے سکون ہوں، تو چلے گا لیکن ہم ہر قیمت پر اپنی اولاد کو علم کے زیور سے آراستہ کریں، ان کی تعلیم وتربیت کا بہتر سے بہتر اور اعلی انتظام کریں۔ اور ہم اپنی اولاد کے ساتھ ساتھ کسی بھی بچے کو تعلیم سے بے بہرہ نہ رہنے دیں۔ یہ ہم سب کی ذمہ داری اور فرض منصبی ہے۔ اس سے غفلت اور بے توجہی جرم اور گناہ ہے۔ افسوس ہوتا ہے کہ قوم کے کتنے نونہال ہیں جن کی آنکھوں سے بلا کی ذہانتیں ٹپکتی ہیں، تعلیم وتربیت کا صحیح انتظام نہ ہونے کی وجہ سے، مالی دشواری کی وجہ سے اور ان کی دیکھ ریکھ اور توجہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ بچے ہوٹلوں میں پلیٹیں صاف کررہے، وہ بچپن ہی میں بندھوا مزدور بنے ہوئے ہیں۔ کیا ہم اپنی غفلتوں کی وجہ سے عنداللہ ماخوذ نہیں ہوں گے؟ یقیناً ہوں گے۔ اللہ تعالی ہمارا ضرور محاسبہ اور مواخذہ کریں گے۔ خدا کرے ہم سب کو اس کا احساس ہوجائے۔

غرض قوموں کی تعمیر وترقی اور عروج وبلندی میں سب سے زیادہ تعلیم ہی کا رول اور کردار ہے۔ مذہب اسلام جو پوری دنیا میں پھیلا اور مذہب اسلام کو جو وسعت ہوئی، اس میں سب سے زیادہ رول اور کردار تعلیم کا ہے۔ صحابہ کرام علم میں گہرے تھے، ان کی معلومات بہت ٹھوس تھیں۔ علم و معرفت کی بھٹی میں انہوں نے اپنے کو تپایا اور پھر جہاں بھی داعی اور مبلغ بن کر گئے پورے ملک میں انقلاب برپا کردیا اور سارے لوگوں کی کایا پلٹ دی۔ آج مسلمانوں کو پھر علم کے ہتھیار سے اپنے کو آراستہ کرنا ہوگا۔ علم کے میدان میں دیگر قوموں سے سبقت ومسابقہ کرنا ہوگا۔ اور پوری نسل کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا ہوگا۔ اس کے لئے معیاری دینی وعصری ادارے قائم کرنے ہوں گے۔ مال و دولت کی اور اپنی صلاحیتوں کی قربانی دینی ہوگی۔ پھر کسی سرسید اور قاسم نانوتوی کو کھڑا ہونا ہوگا۔

☆☆☆

❑ اصلاحیات

بحث وتکرار

سرسید احمد خاں
بانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

سرسید احمد خان کو پڑھنے والے جانتے ہیں کہ انہیں اپنے عہد کے مسلمانوں کی اخلاقی پستی کا بہت قلق تھا، مسلمانوں کے اخلاق کی اصلاح کے لیے انہوں نے بہت سے مضامین لکھے، ذیل میں ان کا ایسا ہی ایک مضمون حاضر خدمت ہے، اس مضمون کا عنوان ہے: ''بحث وتکرار''، جس میں انہوں نے جانوروں، غیر مہذب انسانوں اور مہذب انسانوں کے بحث وتکرار کے طریقوں کا فرق بتایا ہے، مضمون پڑھنے کا ہے، آپ بھی پڑھیے۔ بشکریہ احمد الیاس نعمانی صاحب۔ (ادارہ)

جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آوازان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھلائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چر کر کانوں سے جالگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور عنیف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے میں اور اس کی ٹانگ اس کی کمر میں۔ اس کا کان اس کے منہ میں اور اس کا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں۔ اس نے اس کو کاٹا اور اس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبھوڑا۔ جو کمزور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا۔

نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے۔ دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں، یوں ہے۔ وہ کہتا ہے واہ تم کیا جانو۔ وہ بولتا ہے تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے۔ تیوری چڑھ جاتی ہے۔ رخ بدل جاتا ہے۔ آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں۔ باچھیں چر جاتی ہیں۔ دانت نکل پڑتے ہیں۔ تھوک اڑنے لگتا ہے۔ باچھوں تک کف بھر آتے ہیں۔ سانس جلدی چلتا ہے۔ رگیں تن جاتی ہیں۔ آنکھ، ناک، بھوں، ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ عنیف عنیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستین چڑھا، ہاتھ پھیلا، اس کی گردن اس کے ہاتھ میں اور اس کی ڈاڑھی اس کی مٹھی میں، لپا ڈگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر چھڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک اِدھر چلا گیا اور ایک اُدھر، اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے لپٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی راہ لی۔

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اسی قدر اس

تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرض ہو کر رہ جاتی ہے تو کہیں تو تکار تک نوبت آ جاتی ہے۔ کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذر جاتی ہے۔ مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث وتکرار کرنے سے پرہیز کرے۔ انسانوں میں اختلافِ رائے ضرور ہوتا ہے اور اس کو پرکھنے کے لیے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے، آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے۔ مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب اور شائستگی، محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہ چاہیے۔

پس اے میرے عزیز ہم وطنو! جب تم کسی کے برخلاف کوئی بات کہنی چاہو یا کسی کی بات کی تردید کا ارادہ کرو تو خوش اخلاقی اور تہذیب کو ہاتھ سے مت جانے دو۔ اگر ایک ہی مجلس میں دو بدو بات چیت کرتے ہو تو اور بھی زیادہ نرمی اختیار کرو۔ چہرہ، لہجہ، آواز، وضع، لفظ اس طرح رکھو جس سے تہذیب اور شرافت ظاہر ہو مگر بناوٹ بھی نہ پائی جاوے۔ تردیدی گفتگو کے ساتھ ہمیشہ سادگی سے معذرت کے لفظ استعمال کرو مثلاً یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آیا یا شاید مجھے دھوکا ہوا یا شاید میں غلط سمجھا، گو بات تو عجیب ہے مگر آپ کے فرمانے سے باور کرتا ہوں۔ جب دو تین دفعہ بات کا الٹ پھیر ہو اور کوئی اپنی رائے کو نہ بدلے تو زیادہ تکرار مت بڑھاؤ۔ یہ کہہ کر کہ میں اس بات کو پھر سوچوں گا یا اس پر پھر خیال کروں گا، جھگڑے کو کچھ ہنسی خوشی دوستی کی باتیں کہہ کر ختم کرو۔ دوستی کی باتوں میں اپنے دوست کو یقین دلاؤ کہ اس دو تین دفعہ کی الٹ پھیر سے تمہارے دل میں کچھ کدورت نہیں آئی ہے اور نہ تمہارا مطلب باتوں کی اس الٹ پھیر سے اپنے دوست کو کچھ تکلیف دینے کا تھا کیونکہ جھگڑا یا شبہ زیادہ دنوں تک رہنے سے دونوں کی محبت میں کمی ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ دوستی ٹوٹ جاتی ہے اور ایسی عزیز چیز (جیسے کہ دوستی) ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔

جب کہ تم مجلس میں ہو جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہیں تو جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثے کو آنے مت دو۔ کیونکہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے۔ جب دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگی ہے تو جس قدر جلد ممکن ہو، اس کو ختم کرو۔ اور آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ہم وطن اس بات پر غور کریں کہ ان کی مجلسوں میں آپس کے مباحثے اور تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے۔

☆☆☆